© rasailojaraid.com

پروفیسر ظفر احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

السیرۃ النبویۃ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

تحقیقی و توقیتی مطالعہ (حصہ جدلیات)

انتیسویں قسط

فتنۂ انکار حدیث تشقیق جدلی کی روشنی میں

(تیسرا حصہ): خلفائے راشدینؓ اور حدیث

حضرت ابوبکر صدیقؓ

نہ صرف خلیفۂ اول سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ بل کہ سب ہی صحابہؓ کرائم رسول اللہ ﷺ کی سنت کو دین میں زبردست حجت سمجھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی اس دارِ فانی سے رحلت پر سب سے پہلا مسئلہ آپ کے جسد مبارک کی تدفین کا تھا کہ آپ کو کہاں دفن کیا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس موقع پر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس جگہ اللہ کے نبی کی روح قبض ہوتی ہے وہیں اسے دفن کیا جاتا ہے۔ (۱)

اس حدیث کے سنتے ہی سب اختلاف رفع ہو گیا۔ کوئی ایک آواز بھی نہ اٹھی کہ رسول اللہ ﷺ تو انتقال فرما چکے ہیں اس لیے ان کی حدیث اب ہم پر حجت نہیں رہی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس خبر کے واحد راوی تھے۔ کسی نے آپ سے اس پر کم از کم دو گواہوں کا بل کہ ایک بھی گواہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس

© rasailojaraid.com

۱۔ ابن ماجہ۔ السنن: ما جاء فی الجنائز، رقم ۱۶۳۹

© rasailojaraid.com

صحابہ کرامؓ نے اپنے متفقہ عمل سے واضح کر دیا کہ اگر خبر واحد کا راوی ثقہ اور عادل ہو تو اسے بلا چوں و چرا تسلیم کر لینے پر اصحاب رسول کا اجماع ہے اور صحابہ کرامؓ کا کسی دینی مسئلے پر اجماع دین میں زبردست حجت ہے۔

متعدّد احادیث سے ثابت ہے کہ خلافت و امارت قبیلہ قریش میں ہونی چاہیے۔[۲] سقیفہ بنی ساعدہ میں جب مہاجرین و انصار میں خلافت کے استحقاق پر گرماگرم بحث چل رہی تھی تو جب انہیں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد معلوم ہوا کہ امامت و خلافت قریش میں ہوگی تو فوراً نزاع ختم ہو گیا اور سب نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ خلیفہ بننے کے بعد سب سے پہلا مسئلہ جیش اُسامہؓ کی روانگی اور مانعین زکوٰۃ کے فتنے سے نبٹنے کا تھا۔ آپ کو یہ مشورہ دیا گیا کہ ان انتہائی نازک حالات میں جیش اسامہؓ کی روانگی کو ملتوی کر دیا جائے۔ آپ کو یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ حضرت اسامہؓ بالکل نوعمر ہیں اس لیے ان سنگین حالات اور لمحات میں ان کی بہ جائے کسی تجربہ کار شخص کو اس مہم کا قائد مقرر کیا جائے۔ آپ نے ان دونوں مشوروں کو سختی سے یہ کہتے ہوئے رد فرمایا کہ اگر مجھے اس بات کا یقین ہو کہ اس لشکر کے بھیجنے کے بعد مدینے میں کوئی درندہ اکیلا پا کر مجھے پھاڑ کھائے گا تو بھی میں اس لشکر کی روانگی کو ہرگز ملتوی نہیں کروں گا جسے رسول اللہ ﷺ نے روانہ فرمایا تھا اور میں لشکر کے اس سالار کو ہرگز تبدیل نہیں کروں گا جسے رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا تھا۔[۳] مانعین زکوٰۃ کے خلاف کسی اقدام کو مؤخر کرنے پر بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ ہرگز تیار نہیں ہوئے اور فرمایا: خدا کی قسم! اگر کوئی قبیلہ زکوٰۃ کا ایک جانور یا ایک دانہ بھی جو وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ادا کیا کرتا تھا اب ادا نہیں کرے گا تو میں ضرور بالضرور اس سے قتال کروں گا۔[۴] جب سیّدہ فاطمہؓ نے آپ سے باغ فدک میں اپنی (متصرفانہ) وراثت کا مطالبہ کیا تو چوں کہ اس مطالبے کی پذیرائی میں یہ قوی احتمال تھا کہ لوگ اسے وراثت تصرف کی بہ جائے وراثتِ ملک پر محمول کریں گے اس لیے آپ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد پیش کیا:

لانورث ماترکنا صدقة[۵]

ہمارا کوئی وارث نہیں ہوا کرتا جو ہم (انبیا) چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے۔

۲۔ جمع الفوائد: ج۱، ص۶۱۶، رقم ۵۹۴۴۔۵۹۴۵ بہ حوالہ شیخین، رقم ۵۹۴۶ بہ حوالہ بخاری، رقم ۵۹۴۷ بہ حوالہ ترمذی، رقم ۵۹۴۸ بہ حوالہ احمد

۳۔ ابن کثیر الدمشقی۔ البدایۃ والنھایۃ: ج۶، ص۲۹۷۔۲۹۸

۴۔ البدایۃ والنھایۃ: ج۶، ص۳۰۲

۵۔ جمع الفوائد: ج۱، ص۵۳۲، رقم ۵۱۶۲۔۵۱۶۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک خاتون اپنے پوتے کی میراث مانگنے کے لیے آپ کے پاس آئی تو آپ نے فرمایا کہ دادی کی وراثت کے متعلق میں نہ تو کتاب اللہ میں کوئی حکم پاتا ہوں اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کا کوئی فرمان اس بارے میں مجھے معلوم ہے۔ اس پر حضرت مغیرہؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دادی کو چھٹا حصہ دلاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان سے پوچھا کہ اس پر تمھارے پاس کوئی اور گواہ بھی ہے تو محمدؓ بن مسلمہ نے اس پر شہادت دی اور آپ نے اس خاتون کے لیے اس فیصلے کو نافذ فرمایا۔[۶]

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مروی احادیث کی تعداد ایک سو بیالیس ہے۔ احمد بن علی بن سوید الاموی۔ (۲۰۲ھ۔ ۲۹۲ھ) کی تالیف "مسند ابی بکر" میں ایک سو بیالیس احادیث ہیں۔ اس کتاب تحقیق و تعلیق اور تخریج کا کام شعیب ارناوط نے کیا ہے۔[۷] شاہ ولی اللہؒ کے بہ قول مرویات ابی بکر کی تعداد ڈیڑھ سو ہے۔[۸] خلفائے راشدینؓ اگرچہ روایت حدیث میں سخت محتاط تھے لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ وہ احادیث کو حجت نہیں سمجھتے تھے۔ ورنہ کتب احادیث میں ان سے مروی روایات موجود نہ ہوتیں۔

رسول اللہ ﷺ کی سُنن (سنتوں) کی اہمیت و ضرورت کو واضح کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں ارشاد فرمایا:

> یاایھا الناس قد ولیت امرکم ولست بخیرکم ولکن نزل القرآن وسنن النبی ﷺ السنن فعلمنا وعلمنا۔ ایھا الناس انما انا متبع ولست بمبتدع فان احسنت فاعینونی وان زغت فقومونی۔[۹]
>
> اے لوگو! میں تمھارا حاکم بنا دیا گیا ہوں اور میں تم سے بہتر نہیں ہوں لیکن (یہ خوب سمجھ لو کہ) ہم میں قرآن اترا اور رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اپنی سنتیں سکھائیں، تو آپ نے ہمیں ان سنتوں (طریقوں) کی تعلیم دی اور ہم نے (انہیں) جان لیا۔ اے لوگو! میں تو صرف (کتاب وسنت کی) پیروی کرنے والا ہوں۔ میں کوئی نئی بات نکالنے والا نہیں ہوں۔ اگر میں ٹھیک چلوں تو میری پیروی کرو اور اگر میں ٹیڑھا چلوں تو مجھے سیدھا کرو۔

اس خطبے سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ہر گز یہ عقیدہ نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ

۶۔ ذہبی۔ تذکرہ الحفاظ: ج ۱، ص ۳

۷۔ فہیم عثمانی۔ حفاظت و حجیت حدیث: ص ۲۰۱، دار الکتب مسجد مقدس طبع اول ۱۹۷۹ء لاہور

۸۔ شاہ ولی اللہ۔ ازالۃ الخفاء: ج ۲، ص ۲۱

۹۔ ابن سعد۔ الطبقات الکبریٰ: ج ۲، ص ۱۲۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اقوال وافعال (سُنن) صرف دور نبوی تک کے لیے حجت تھے۔ وہ اپنے خطبے میں قرآن و سنت دونوں کے اتباع کا عزم بالجزم ظاہر فرمارہے ہیں۔ان کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں تھا کہ خلیفہ یا حاکم اعلیٰ کو اپنی طرف سے یا دوسروں کے مشورے سے دینی مسائل اور جزئیات وضع کرنے کا کوئی حق یا اختیار حاصل ہے، اسی لیے انہوں نے فرمایا کہ میں دین میں کوئی نیا طریقہ نکالنے والا نہیں ہوں۔انہوں نے یہ بھی واضح فرمایا کہ غیر مشروط اطاعت صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہی ہو سکتی ہے۔ میری اطاعت کتاب وسنت کی اتباع کے ساتھ مشروط ہے اور اگر میں اس سے انحراف کروں تو تمہیں مجھے سیدھا کرنے کا حق حاصل ہے۔ اپنی خلافت کے اس پہلے خطبے میں آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ”اطیعونی مااطعت اللہ ورسولہ فان عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم“ (۱۰) ”تم میری اطاعت کرو جب تک کہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو پھر تم پر میری کوئی اطاعت نہیں“۔اس سے معلوم ہوا کہ دورِ حاضر کے منکرین حدیث کا یہ قول مضحکہ خیز حد تک لغو اور باطل ہے کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم ہے اس سے حاکم وقت (منکرین حدیث کے مفروضہ مرکز ملت) کی اطاعت مراد ہے۔ اگر ایسا ہو تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خطبے کے مذکورہ حصے کا معنی یہ ہوگا کہ جب تک میں اپنی اطاعت کرتا رہوں تو تم بھی میری اطاعت کرو اور اگر میں اپنی نافرمانی کروں تو تم پر میری کوئی اطاعت نہیں۔ ظاہر ہے کہ خطبے کا ایسا مفہوم لغو اور باطل ہے۔

ان مثالوں سے یہ واضح ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سنتِ رسول سے سرمو انحراف بھی گوارا نہ تھا۔

مسند دارمی میں ہے: کان ابوبکر اذو رد علیہ الخصم نظر فی کتاب اللہ فان وجد فیہ مایقضی بیھنم قضی وان لم یکن فی الکتاب وعلم من رسول اللہ ﷺ فی ذالک سنّتہ قضی بہ فان اعیاہ ذالک خرج فسأل المسلمین۔ طبقات ابن سعد میں ہے: ان ابابکر اذا نزلت بہ قضیۃ لم یجد لھا فی کتاب اللہ اصلا ولا فی السنۃ اثرا فقال اجتھد برأیی فان یکن صوابا فمن اللہ وان یکن خطأ فمنی واستغفر اللہ۔ (۱۱) ”جب ابوبکر صدیقؓ کے سامنے ایسا معاملہ پیش آتا جس کے متعلق آپ نہ تو کوئی کتاب اللہ میں کوئی واضح حکم پاتے اور نہ ہی سنت نبوی میں اس کے متعلق کسی روایت کا پتہ

۱۰۔ طبری: ج۲، ص۴۵۰

© rasailojaraid.com

۱۱۔ طبقات: ج۳، ص۱۳۶

© rasailojaraid.com

چلتا تو فرماتے کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، درست ہوا تو یہ اللہ کی طرف سے ہے، اگر مجھ سے غلطی ہوئی تو یہ میری طرف سے ہے اور اس پر میں اللہ سے معافی کا خواست گار ہوں"۔

حضرت عمر فاروقؓ

حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بصرہ کا والی مقرر کیا تو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے لوگوں کے سامنے اپنے خطبے میں یہ بات فرمائی کہ: بعثنی عمر لا علمکم کتاب ربکم و سنة نبیکم [۱۲] مجھے عمرؓ نے بھیجا ہے تاکہ میں تمہیں تمھارے رب کی کتاب اور تمھارے نبی کی سنت کی تعلیم دوں"۔ تاریخ ابن اثیر میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حج کے موقع پر اپنے خطبے میں عام اعلان فرمایا۔" ایها الناس لم اعمل عمالا لا لیضربوا ابناء کم و لا لیأخذوا اموالکم و انما ارستلهم الیکم لیعلموکم دینکم و سنة نبیکم"۔ [۱۳] "اے لوگو! میں نے عمّال کا تقرر اس لیے نہیں کیا ہے کہ وہ تمھارے بیٹوں کو ماریں اور نہ اس لیے کیا ہے کہ وہ تم سے تمھارے اموال چھینیں۔ میں نے تو انہیں صرف اس لیے تمھارے لیے پاس بھیجا ہے کہ وہ تمہیں تمھارے دین اور تمھارے نبی کی سنت کی تعلیم دیں"۔ قاضی شُریح کو آپ نے لکھا:

> اذأ اتاك امر فاقض بما فی کتاب الله فان اتاك مالیس فی الکتاب فاقض بماسن فیه رسول الله ﷺ۔ [۱۴]
>
> اگر تمھارے پاس فیصلے کے لیے کوئی مقدمہ آئے تو اس کا کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرو۔ اور اگر کوئی ایسی چیز ہو جو کتاب اللہ میں نہیں تو اس میں رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق فیصلہ کرو۔
>
> نیز حضرت عمرؓ سے یہ بھی منقول ہے:
>
> یا ایها الناس الرأی انما کان من رسول الله مصیباً لأنّ الله کان یریه و انّما هو منا الظنّ و التکلّف۔ [۱۵]

۱۲۔ دارمی۔ السنن: ص ۶۵

۱۳۔ ابن اثیر۔ تاریخ: ص ۲۰۸۔ ابن عبدالبرّ۔ جامع بیان العلم: ج ۲: ص ۱۲۳

۱۴۔ شاطبی۔ الموافقات: ج ۲: ص [illegible]

۱۵۔ ابن قیم۔ اعلام الموقعین ابن قیم: ج ۱، ص ۴۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اے لوگو! رسول اللہ ﷺ کی رائے لازماً درست ہے کیوں کہ اللہ آپ کی رہ نمائی فرماتا تھا۔ ہماری رائے تو صرف گمان اور تکلف ہے۔

حافظ ابن عبدالبرّ نے حضرت عمرؓ کا یہ قول بھی جامع بیان العلم میں نقل کیا ہے: سیأتی قوم یجادلونکم بشھادت القرآن فخذوھم بالسّنن فانّ اصحاب السّنن اعلم بکتاب اللہ۔[16] "عن قریب ایک ایسی قوم ظاہر ہوگی جو تم سے قرآن کی متشابہ آیات کے ساتھ جھگڑا کرے گی تم انہیں سُنن (احادیث) کے ذریعہ پکڑو، کیوں کہ اہل سُنن ہی اللہ کی کتاب کو سب سے زیادہ سمجھنے والے ہیں"۔ حافظ ابن عبدالبرّ اپنی کتاب جامع بیان العلم میں مزید لکھتے ہیں: کان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ یکتب الی الآفاق ان یتعلمو السنۃ و الفرائض و اللّحن یعنی النحوا کما یتعلم القرآن[17] "عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اردگرد کے تمام عمّال اور والیوں کو لکھا کرتے تھے کہ لوگ سُنن (احادیث رسول) فرائض اور لحن یعنی نحو کو ایسے ہی سیکھیں جیسے قرآن سیکھا جاتا ہے"۔ کتب احادیث میں حضرت عمرؓ سے مروی پانچ سو سینتیس روایات ہیں۔[18] حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا ردّوا الجھالات الی السنۃ[19] "جہالتوں کو سنتوں کی طرف لوٹاؤ"۔ یعنی جہاں علم نہ ہو تو رسول اللہ ﷺ کی سنتوں سے رہ نمائی حاصل کرو۔ آپ نے حکام کو یہ حکم لکھ کر بھیجا: تعلموا الفرائض والسنۃ کما تتعلّمون القرآن[20] "تم فرائض (میراث) اور سنت کا علم ایسے ہی حاصل کرو جیسے تم قرآن سیکھتے ہو"۔ (آپ نے حجرِ اسود کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: لا تضرّ و لا تنفع و لو لا انی رأیت رسول اللہ ﷺ یقبلك ما قبلتك[21] "تو صرف ایک پتھر ہے جو نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی نفع پہنچا سکتا ہے۔ اور اگر میں رسول اللہ ﷺ کو تجھے چومتے نہ دیکھتا تو میں تجھے نہ چومتا"۔

حضرت عثمانؓ

آپ کے پاس ایک مرتبہ وضو کے لیے پانی لایا گیا۔ آپ نے ایک جگہ بیٹھ کر نہایت عمدہ طریقے سے وضو کرنے کے بعد فرمایا: رأیت رسول اللہ ﷺ توضّأ وھو فی ھذا المجلس

۱۶۔ جامع البیان العلم: ج ۲، ص ۱۲۳

۱۷۔ ایضاً: ج ۲، ص ۱۶۸

۱۸۔ ابن جوزی۔ التلقیح: ص ۱۰۴

۱۹۔ جامع بیان العلم: ج ۲، ص ۱۰۸

۲۰۔ ایضاً: ج ۱، ص ۴۲

۲۱۔ جمع الفوائد: ج ۱، ص ۳۴۴، رقم ۳۳۸۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فاحسن الوضوء"[۲۲] "میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ نے اسی بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھ کر وضو فرمایا اور نہایت اچھا وضو فرمایا"۔ حج کے ایک موقع پر آپ مزدلفہ میں قیام پذیر تھے۔ نماز فجر کے وقت کافی روشنی پھیل گئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود بھی وہیں موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر آپ اس وقت منیٰ کے لیے چل پڑیں تو یہ سنت نبوی کے عین مطابق ہوگا۔ اس پر آپ فوراً وہاں سے چل پڑے۔ چلنے میں آپ نے اتنی جلدی فرمائی کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی زبان سے بات پہلے نکلی تھی یا آپ پہلے چل پڑے تھے۔ قربانی کے دن رمی کرنے تک آپ لگاتار تلبیہ (اللھم لبیک تا آخر) کرتے رہے۔[۲۳] ایک مرتبہ حج کے موقع پر ایک اور صحابی کے ہمراہ آپ طواف فرما رہے تھے۔ انہوں نے رکنِ یمانی کا بوسہ لیا اور یہ چاہا کہ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ لیکن آپ نے پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے بھی رکنِ یمانی کا بوسہ لیا تھا۔ انہوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ کیا رسول اللہ ﷺ کا اتباع ہی سب سے بہتر نہیں ہے؟ انہوں نے کہا، بے شک"۔[۲۴] آپ اگر کبھی مسجد میں آرام فرماتے تو رسول اللہ ﷺ کی طرح پاؤں پر پاؤں رکھ کر لیٹتے تھے۔[۲۵] ایک مرتبہ وضو سے فارغ ہونے کے بعد آپ مسکرائے۔ لوگوں کے پوچھنے پر فرمایا کہ میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا ہے[۲۶] آپ کی خلافت کے آخری ایام میں جب باغیوں نے قصر خلافت کا محاصرہ کر رکھا تھا تو انہیں مخاطب کرتے ہوئے آپ نے رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا بھی حوالہ دیا "لا یحلّ دم امرء مسلم الا فی احدیٰ ثلٰث رجل کفر بعد ایمانہ او زنی بعد احصانہ او قتل نفسا بغیر نفس"[۲۷] "کسی مسلمان کا خون تین صورتوں کے سوا حلال نہیں ہے۔ کوئی شخص اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کرے یا شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کرے یا کسی جان کو کسی دوسری جان کے قتل کے بدلے کے سوا قتل کرے"۔ باغیوں کو یہ کہنے کی جسارت نہیں ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد آپ کی حدیث تو (معاذ اللہ) کسی کے لیے حجت ہی نہیں رہی۔

۲۲۔ بخاری: کتاب الرقاق باب قول اللہ یایھا الذین ان وعد اللہ حق

۲۳۔ بخاری کتاب المناسک باب متی یصلی الفجر بجمع: ج ۱، ص ۲۲۸

۲۴۔ مسند احمد: ج ۱، ص ۷۰

۲۵۔ مسند احمد: ج ۱، ص ۵۸ بخاری: ج ۱، ص ۶۸ کتاب الصلٰوۃ باب الاستلقاء فی المسجد

۲۶۔ بخاری: کتاب الصل

© rasailojaraid.com

۲۷۔ البدایۃ والنھایۃ: ج ۱، ص ۱۷۹

© rasailojaraid.com

حضرت علیؓ

آپ نے رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث لکھ رکھی تھیں اور آپ نے ان کا نام صحیفہ رکھا ہوا تھا۔ اس صحیفے کا صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں ذکر ملتا ہے[۲۸] روایات کی یہ تحریر آپ کی تلوار کے نیام میں لٹکی رہتی تھی۔ اس میں مالی امور زکوٰۃ و صدقات نیز دیت و قصاص وغیرہ کے متعلق ہدایات تھیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: من زعم ان عندنا شیئاً نقرؤہ الاّ کتاب اللہ و ھذہ الصحیفۃ فقد کذب۔[۲۹] "جو شخص یہ خیال کرے کہ ہمارے پاس قرآن کریم اور اس صحیفے کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے تو اس نے جھوٹ بولا"۔

جنگ صفین کے بعد جب عبداللہ بن سبا اور اس کے ساتھیوں نے جھوٹی احادیث گھڑنا شروع کیں تو آپ نے نہایت ضروری سمجھا کہ ان فتنہ جو لوگوں کے خلاف عوام کو متنبہ کیا جائے اور صحیح احادیث کو پھیلایا جائے۔ چناں چہ آپ نے اپنا یہ صحیفہ لوگوں کو بر سرِ عام دکھلایا اور منبر پر اعلان فرمایا کہ کون ہے جو ایک درہم کے کاغذ خرید لائے تو میں اس کے لیے ان اوراق پر علم لکھ دوں۔ اس پر حارث اعور ایک درہم کے عوض کاغذ خرید لایا جس پر آپ نے بہت سی احادیث لکھ دیں۔[۳۰] مصفح عامری کہتے ہیں کہ آپ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ ہم اہل بیت ہیں۔ کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کو زیادہ جاننے والے ہیں ہم سے علم سیکھو۔[۳۱]

فریب کا جال

اہل باطل اپنے جھوٹے افکار و نظریات کے پرچار کے لیے اگر جھوٹ اور فریب کی فصل کاشت نہ کریں تو اپنے مذموم مقاصد میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ پرویزی منکرین حدیث کی حدیث کے (معاذ اللہ) حجت اور واجب التسلیم نہ ہونے پر ایک کتاب "مقام حدیث" کے نام سے ہے جس کے کچھ مباحث حافظ محمد اسلم جیراجپوری کے تحریر کردہ میں اور بقیہ مباحث ان کے لیے شاگرد مسٹر غلام احمد پرویز کے قلم سے ہیں۔ انکار حدیث پر نام نہاد دلائل کے سلسلے میں یہ کتاب پرویزی منکرین حدیث کے حلقے

۲۸۔ بخاری: کتاب العلم، کتاب الحج، باب فضائل المدینۃ، کتاب الجہاد، باب فکاک الاسیر، باب ذمۃ المسلمین

۲۹۔ مسلم: ج ا، ص ۴۴۲، ۴۹۵۔ بخاری: کتاب العلم: ج ا، ص ۲۱۔ بخاری: ج ا، ص ۲۵۱ باب فضائل المدینۃ

۳۰۔ طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۱۰۱

© rasailojaraid.com

۳۱۔ ایضاً: ص ۲۷۶

© rasailojaraid.com

میں ایک طرح کی "مقدس بائیبل" کی حیثیت رکھتی ہے۔ روایت وکتابت حدیث کے متعلق اس کتاب میں جس طرح جھوٹ اور فریب کا سہارا لیا گیا ہے اس کے احاطے اور استیعاب (یعنی ہر ہر جھوٹ اور فریب کو ظاہر کرنے) کی ہم قطعاً ضرورت نہیں سمجھتے، کیوں کہ آئندہ سطور میں اس جھوٹ اور فریب کے جو متعدّد نمونے ہم نے پیش کئے ہیں۔ وہ ہی اس کتاب کے مصنفین کو مفتری، کذّاب اور خائن ثابت کرنے کے لیے کافی اور وافی ہیں۔ چنانچہ اس کے کچھ نمونے مع تبصرے وجواب پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ "مقام حدیث" میں ہے:" رسول اللہ ﷺ نے تاکید کی تھی کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے سے بچو۔ (ابن ماجہ) اس لیے عہد رسالت میں حدیثیں بہت تھوڑی تھیں، اور وہ بھی اخباری حیثیت رکھتی ہیں"[۳۲] منکر حدیث محمد اسلم جیراج پوری کو منعِ روایت کے سلسلے میں صحاح ستہ میں صرف ایک روایت ملی، اور حدیث بیان کرنے کے جو تاکیدی احکام رسول اللہ ﷺ نے مثلاً خطبہ حجۃ الوداع اور دیگر کئی مواقع پر دیے، اور یہ سب کچھ صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث میں بھی موجود ہے، اسے بالکل چھوڑ دیا۔ نیز ابن ماجہ کی پوری متعلقہ روایت یوں ہے: إیاکم و کثرۃ الحدیث علیّ فمن قال علیّ ما لم أقل فلیتبوأ مقعدہ فی النار[۳۳] "مجھ سے (منسوب) زیادہ حدیثیں بیان کرنے سے بچو، تو جس شخص نے مجھ پر جھوٹ باندھا اور وہ بات کہی جو میں نے نہیں کہی تھی، تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے"۔ روایت کا آخری حصہ چھوڑ کر بددیانتی، دھوکے اور علمی خیانت کا بدترین اور شرم ناک ارتکاب کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اونٹنی پر سوار ہو کر منیٰ کے مقام پر اپنے طویل خطبے میں یہ بھی ارشاد فرمایا تھا: فلیبلغ الشاھد الغائب فان الشاھد عسیٰ أن یبلغ من ھو اوعی لہ منہ[۳۴] "جو یہاں حاضر ہے وہ میری باتیں اس کو بھی پہنچادے جو غائب ہے، کیوں کہ جو حاضر ہے تو شاید وہ ایسے شخص کو میری بات پہنچائے جو اس بات کو اس پہنچانے والے سے زیادہ یاد رکھنے والا ہو۔" نیز خطبہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: لتسمعون ویسمع منکم ویسمع ممن یسمع منکم[۳۵] "تم میری باتیں سن رہے ہو اور تم سے سنا جائے اور وہ (پھر) اس شخص سے بھی سنا جائے گا جس نے تم سے سنا"۔ یعنی تم (میرے اصحاب) سے تابعین اور تابعین

۳۲۔ مقام حدیث: ص ۴۷

۳۳۔ ابن ماجہ: باب التغلیظ فی تعمد الکذب

۳۴۔ بخاری: کتاب العلم، باب ربّ مبلغ

۳۵۔ [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے تبع تابعین سنیں گے، اور یہ سلسلہ آگے تک چلتا جائے گا۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: نضّر اللہ عبدا سمع مقالتی فوعاھا ثم اداھا و بلغھا[۳۶] "اللہ اس بندے کو شاداب رکھے جس نے میری باتیں سنیں پھر انہیں یاد رکھا اور پھر انہیں دوسروں تک پہنچایا"۔

قبیلہ عبد القیس کا وفد مدینے میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے انہیں دین کی نہایت اہم باتیں بتائیں، اور جب وہ آپ ﷺ سے رخصت ہونے لگے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: احفظوا واخبروا من وراء کم[۳۷] "ان باتوں کو یاد کر لو اور اپنے پیچھے آنے والوں کو بھی ان سے باخبر کرو"۔ عام الوفود میں اطراف و جوانب سے بہت سے عرب قبائل اسلام قبول کرنے کے لیے مدینے میں وفود کی صورت میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ آپ ﷺ ان وفود کو ایسے مقام پر ٹھہراتے تھے، جہاں سے وہ آپ ﷺ کے روز مرہ کے دینی معمولات کا آسانی سے بہ غور مشاہدہ و معائنہ کر سکیں۔ آپ ﷺ ان وفود کو دینی عقائد، ارکان اور اہم معاملات سے متعلق بیش قیمت ہدایات سے نوازتے تھے۔ مالک بن حویرثؓ اپنے وفد کے ہم راہ مدینے میں بیس دن تک رہے اور آپ کی قولی و فعلی سُنن سے مستفید ہوتے رہے۔ رخصت ہونے لگے تو آپ نے فرمایا: صلوا کما رأیتمونی اصلی[۳۸] "تم اسی طرح نماز پڑھا کرو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے"۔ مسجد نبوی میں ایک چبوترہ (صُفّہ) تھا جہاں وہ فاقہ مست صحابہ کرامؓ قیام پذیر رہتے تھے جو دینوی مشاغل سے یک سر بے نیاز ہو کر رسول اللہ ﷺ سے دینی علم حاصل کرنے پر نہایت حریص تھے۔ آپ جب اطراف واکناف میں کسی کو عامل (گورنر)، قاضی یا مبلغ بنا کر بھیجتے تو اکثر و بیشتر ان ہی اصحاب صفہ میں سے کسی کو بھیجتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ بھی ان ہی اصحاب صفہ میں شامل تھے۔ انہوں نے آپ سے ضعفِ حافظہ کی شکایت کی کہ مجھے آپ کی احادیث یاد نہیں رہتیں۔ آپ نے ان کے لیے خاص دعا فرمائی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے کبھی کوئی حدیث نہیں بھولی۔[۳۹] حضرت عبد اللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے (نماز کا) تشہد ایسے سکھایا جیسے آپ قرآن کی ایک سورت سکھاتے تھے۔[۴۰] یہ ہی

۳۶۔ ترمذی: ج ۲، ص ۲۶

۳۷۔ بخاری: کتاب العلم، باب من اجاب

۳۸۔ بخاری: کتاب اخبار الآحاد

۳۹۔ ایضاً: کتاب العلم باب حفظ [illegible]

۴۰۔ مسلم: کتاب الصلوٰۃ باب التشہد فی الصلوٰۃ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی بصیغۂ جمع ہے کہ ہم (اصحاب رسول کو آپ اسی طرح تشہد سکھایا کرتے تھے جیسے قرآن کی کوئی سورت سکھائی جاتی ہے)۔[41] حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں دعائے استخارہ اسی طرح سکھاتے تھے جیسے آپ قرآن کی کوئی سورت سکھاتے تھے۔[42] نیز آپ ادعیہ واذکار وغیرہ کی باقاعدہ تعلیم دیتے تھے اور متعلقہ کلمات اپنے اصحاب کو سکھاتے تھے۔ مثلاً حضرت ابو سعیدؓ قرضوں اور دیگر ہموم وافکار کی وجہ سے مغموم و پریشان بیٹھے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسا کلام نہ سکھاؤں جس سے تمھارا غم دور اور قرضہ ادا ہو جائے۔ انہوں نے عرض کیا، کیوں نہیں یا رسول اللہ! اس پر آپ نے فرمایا صبح وشام پڑھو اللّٰھم انی اعوذ بك من الھم والحزن الی آخر الحدیث[43] حضرت اسماء بنت عمیس کہتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کیا میں تجھے ایسے کلمات نہ سکھاؤں جنہیں تو تکلیف اور پریشانی کے موقع پر کہا کرے؟ یہ کلمات ہیں: اللہ اللہ ربی لا اشرك به شئیاً[44] "اللہ، اللہ میرا رب ہے میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا/کرتی"۔ حضرت شدّاد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں اس دعا کی تعلیم دیا کرتے تھے: اللّٰھم انی اسئلك الثبات فی الامر وعزیمۃ الرشد الخ[45] حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ دریں اثناء حضرت علیؓ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ قرآن مجھے یاد نہیں رہتا تو آپ نے فرمایا کہ اے ابوالحسن! میں تجھے ایسے کلمات سکھاتا ہوں جو تجھے نفع دیں گے اور جو علم تیرے سینے میں ہے وہ محفوظ اور ثابت رہے گا (یعنی آپ بھولیں گے نہیں)۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا، ہاں یا رسول اللہ؟ پھر آپ نے انہیں جمعۃ المبارک کی رات خاص (نفل) نماز کا طریقہ اور تشہد کے آخر میں متعلقہ دعا سکھائی۔[46] حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک دعا سیکھی ہے میں اسے پڑھنا نہیں چھوڑتا:

۴۱۔ ایضاً

۴۲۔ جمع الفوائد: ج ۱، ص ۲۲۰، رقم ۲۲۲۴ عن جابرؓ

۴۳۔ جمع الفوائد: ج ۲، ص ۵۰۹، رقم ۹۴۱۳

۴۴۔ ایضاً: رقم ۱۹۴۱۵

۴۵۔ ایضاً: ج ۲، ص ۵۰۹ـ۵۱۰، رقم ۹۴۱۹

۴۶۔ ایضاً: ج ۲، ص ۵۱۰، رقم ۹۴۲۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللّٰھم اجعلنی اعظم شکرک الخ[47] حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ مجھے نبی ﷺ نے یہ دعا سکھائی: اللھم اجعل سریرتی خیرا من علانیتی الخ[48] حضرت طارقؓ بن اشیم سے روایت ہے کہ جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا تو رسول اللہ ﷺ اسے نماز سکھاتے تھے پھر اسے یہ حکم دیا کرتے تھے کہ ان کلمات کے ساتھ دعا کیا کرو: اللھم اغفرلی وارحمنی واھدنی وعافنی وارزقنی۔[49] "اے اللہ! مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما اور مجھے ہدایت دے اور مجھے عافیت دے اور مجھے رزق عطا فرما"۔ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو ادائے قرض کے لیے یہ دعا سکھائی اور فرمایا کہ یہ وہ کلمات ہیں جن کی تعلیم مجھے نبی ﷺ نے دی ہے: اللھم اکفنی بحلالک عن حرامک واغننی بفضلک عمن سواک[50] "اے اللہ! اپنے حلال رزق کے ذریعہ میرے لیے اپنے حرام سے کافی ہو جا اور اپنے فضل سے مجھے اپنے سوا دوسروں سے مستغنی کر دے"۔ حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ بہت سی دعائیں مانگتے رہتے ہیں لیکن ہمیں یاد نہیں رہتیں تو آپ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی دعا نہ سکھاؤں جو ان سب کی جامع ہے تو یہ کہا کرو: اللّٰھم انا نسئلك من خیر ماسئلك منه نبیك محمد ﷺ الخ[51]۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ہمیں یہ دعا اسی طرح سکھایا کرتے تھے جیسے قرآن کی کوئی سورت سکھاتے تھے۔: اللّٰھم انی اعوذبک من عذاب جھنم الخ[52]۔ حضرت ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کے پاس آکر عرض کیا کہ میں قرآن کریم یاد نہیں کر سکتا مجھے ایسے کلمات سکھا دیجیے جو اس کے بدلے مجھے کفایت کریں تو آپ نے فرمایا: یوں کہو سبحان اللہ والحمد للہ و لا الٰہ الاّ اللہ واللہ اکبر و لا حول و لا قوۃ الاّ باللہ۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ (سارے کلمات) تو اللہ کے لیے ہوئے، میرے لیے کون سے کلمات ہیں۔ آپ نے فرمایا: یوں کہا کرو اللّٰھم ارحمنی

۴۷۔ جمع الفوائد: ج ۲، ص ۵۱۵، رقم ۹۴۵۵ للترمذی

۴۸۔ ایضاً: ج ۲، ص ۵۱۶، رقم ۹۴۶۵

۴۹۔ ایضاً: ج ۲، ص ۵۱۶، رقم ۹۴۷۱

۵۰۔ ایضاً: ج ۲، ص ۵۱۷، رقم ۹۴۸۰

۵۱۔ ایضاً: ج ۲، ص ۵۱۸، رقم ۹۴۹۱

۵۲۔ ایضاً: ج ۲، ص ۵۲۱، رقم ۹۵۱۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وعافنی واھدنی وارزقنی الیٰ آخر الحدیث [۵۳] اس طرح کی لاتعداد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ اکثر ادعیہ واذکار کے کلمات صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ سے ایسے ہی سیکھا کرتے تھے جیسے قرآن کی سورتیں سیکھتے تھے۔

عورتوں کے ایک وفد نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مرد ہم پر علم سیکھنے میں سبقت لے گئے ہیں، ہمارے لیے بھی کوئی وقت مقرر فرما دیجیے تو آپ نے ان کے لیے ایک دن مقرر فرما دیا، اور پہلے دن جو علم انہیں سکھلایا اس کا حدیث سے ہی تعلق تھا۔ [۵۴]

۲۔ منکرین حدیث کی کتاب "مقام حدیث" میں لکھا ہے "حضرت ابو بکرؓ نے روایت کی یک قلم ممانعت کر دی اور لوگوں کو جمع کر کے فرمایا، تم جب آج اختلاف کرتے ہو تو آئندہ نسلیں اور بھی اختلاف کریں گی لہٰذا رسول اللہ ﷺ سے کوئی روایت نہ کرو اور اگر کوئی پوچھے تو کہہ دو کہ ہمارے اور تمھارے درمیان قرآن ہے جو اس نے جائز کیا ہے اس کو جائز اور جو اس نے ناجائز کیا ہے اس کو ناجائز سمجھو مگر باوجود اس ممانعت کے بھی روایت کا سلسلہ جاری رہا کیوں کہ اس کو جرم قرار نہیں دیا گیا"۔ [۵۵]

تبصرہ

مذکورہ بالا روایت امام ذہبیؒ کی کتاب "تذکرہ الحفاظ" سے لی گئی ہے اور اس کے متعلق خود امام ذہبیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ابن ملیکہ کی مُرسل روایت ہے کیوں کہ سند کے آخر میں کسی صحابی کا نام نہیں ہے، پس یہ روایت سرے سے قابل احتجاج ہی نہیں یعنی اس روایت سے استدلال درست نہیں۔ منکرین حدیث کی طرف سے کتاب کے مصنف کے مذکورہ تبصرہ کو بیان نہ کرنا زبردست علمی خیانت اور دھوکہ ہے۔ اگر اس ناقابل اعتماد مرسل روایت سے استدلال کی ناحق گنجائش نکالی بھی جائے تو اس پر خود کتاب کے مصنف امام ذہبیؒ کا تبصرہ یہ ہے ان مراد الصدیق التثبت فی الاخبار والتحری لاسد باب الروایة الاترا ہ انه لما نزل به امر بجدة ولم یجده فی الکتاب کیف سٔل عنه فی السنن فلما اخبره الثقة ما اکتفی حتی استظهر بثقة اخر ولم یقل حسبنا کتاب الله کما تقوله الخوارج [۵۶] یعنی " اس روایت سے صدیق اکبر کا مقصد یہ ہے کہ روایت میں تحقیق اور

۵۳۔ ایضاً: ج۲، ص۲، ۵۲، رقم ۹۵۱۸
۵۴۔ بخاری: کتاب العلم، باب ھل یجعل للنساء
۵۵۔ مقام حدیث: ص ۷۶
۵۶۔ تذکرۃ الحفاظ: ج۱، ص ۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احتیاط ضروری ہے نہ یہ کہ روایت کا دروازہ ہی بند کر دیا جائے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ جب انہیں دادی (کی وارثت) کا مسئلہ پیش آیا اور اس کا حکم انہیں کتاب اللہ (قرآن) سے نہ ملا تو کس طرح اس کے متعلق احادیث نبویہ کے بارے میں پوچھا۔ پھر جب ایک معتبر آدمی نے اس کے متعلق (حدیث نبوی کی) خبر دی تو اس پر اکتفا نہ فرمایا بل کہ ایک دوسرے ثقہ آدمی کی توثیق طلب کی اور خوارج کی طرح یوں نہیں کہہ دیا کہ بس ہمیں تو اللہ کی کتاب ہی کافی ہے"۔ منکرین حدیث کی طرف سے امام ذہبیؒ کے اس تبصرے سے لوگوں کو بے خبر رکھنا ان کی مزید علمی خیانت ہے۔

اوپر "خلفائے راشدینؓ اور حدیث" کے عنوان کے تحت مباحث سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مقام تدفین، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے انعقادِ خلافت کا فیصلہ ان احادیث سے ہوا تھا جو آپ نے اس موقع پر لوگوں کو سنائی تھیں۔ آپ نے اپنے پہلے خطبے میں اللہ اور رسول کی اطاعت پر قائم رہنے کا عہد فرمایا۔ جیش اسامہؓ کی روانگی، مانعین زکوٰۃ کے خلاف مسلح جہاد، جیش اسامہ کے قائد حضرت اسامہ بن زیدؓ کی برقراری پر سنت رسول کا آپ نے حوالہ دیا اور اس سے ذرہ بھر بھی انحراف نہ کرنے کا عزم دہرایا اور جیسا کہ امام ذہبیؒ نے بھی حوالہ دیا ہے دادی کی وارثت کے مسئلہ پر حدیثِ رسول کا علم ہوا تو اسی پر عمل فرمایا، اس طرح کے واقعات صاف بتا رہے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہرگز ہرگز حجیتِ حدیث کے منکر نہیں تھے۔ الغرض آپ نے ان لوگوں کو روایات بیان کرنے سے روکا جو اس کے اہل نہیں تھے اور روایات کے بیان میں باہم اختلاف کر رہے تھے۔ آپ نے احادیث بیان کرنے کی یک قلم ممانعت فرمائی ہوتی تو روایت حدیث کا سلسلہ ہرگز جاری نہ رہتا اور خود حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بہت سی روایات کتبِ حدیث میں منتقل نہ ہوتیں۔

۳۔ حافظ ابن عبدالبرؒ کی کتاب "جامع بیان العلم" کے ایک باب کا عنوان ہے باب ذکر من ذمّ الاکثار من الحدیث دون التفهم له و التفقه فيه "ان لوگوں کا بیان جنہوں نے احادیث کو سمجھے اور ان میں غور و فکر کیے بغیر زیادہ احادیث بیان کرنے کی مذمت کی ہے"۔ یہ عنوان ہی بتا رہا ہے کہ ان لوگوں کے لیے احادیث کو بہ کثرت بیان کرنا مذموم ہے جو نہ تو احادیث کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کے معانی و مفاہیم میں وہ کوئی غور و فکر کرتے ہیں۔ لہٰذا اس باب کے تحت مذکور روایات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ حدیث حجت نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی محمد اسلم جیراج پوری دھوکے اور فریب کی چال سے باز نہ آئے وہ لکھتے ہیں "قرظہ بن کعب کہتے ہیں کہ ہم ایک جماعت کے ساتھ عراق کو روانہ ہوئے۔ حضرت عمرؓ مقام صرار تک ہم کو رخصت کرنے کے لیے ساتھ آئے۔ وہاں پہنچ کر فرمایا تم جانتے ہو میں یہاں کیوں آیا ہوں؟۔ ہم نے کہا، ہماری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متابعت اور تکریم کی غرض سے۔ اور فرمایا ہاں اور اس لیے بھی کہ تم سے کہوں کہ تم وہاں جا رہے ہو جہاں لوگوں کی تلاوت قرآن کی آواز شہد کی مکھیوں کی آواز کی طرح گونجتی رہتی ہے، لہٰذا ان کو حدیثوں میں پھنسا کر قرآن سے نہ روکنا اور روایتیں نہ سنانا۔ قرظہ کہتے ہیں اس دن کے بعد سے پھر میں نے کبھی حدیث بیان نہیں کی"۔ (۵۷)

تبصرہ

حافظ ابن عبدالبرؒ نے متعلقہ باب کے شروع میں ہی تین روایات لکھی ہیں۔ پہلی روایت کے الفاظ ہیں "فلا تصدوھم بالحدیث" "سو تم انہیں حدیث کے سبب (قرآن سے) نہ روکنا"۔ ان الفاظ کے اردو ترجمے میں "حدیثوں میں پھنسا کر" کے کلمات اسلم جیراج پوری کے خانہ ساز ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری اور تیسری روایت میں حضرت عمرؓ کے الفاظ ہیں واقلوا الروایۃ یعنی آپ نے فرمایا تھا کہ "احادیث کم بیان کرنا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے روایت حدیث میں سخت احتیاط سے کام لینے کا حکم دیا تھا۔ روایت حدیث سے مطلقاً منع نہیں فرمایا تھا، ورنہ اگر حدیث سرے سے حجت اور ماخذِ شریعت نہ ہوتی تو آپ روایت حدیث کو مطلقاً ممنوع قرار دیتے اور تھوڑی تعداد میں بل کہ ایک بھی روایت کو بیان کرنے کی ہرگز اجازت نہ دیتے۔ اگر حضرت عمرؓ روایت حدیث کے سرے سے قائل نہ ہوتے تو کتب احادیث میں ان سے مروی ایک بھی روایت نہ ملتی۔ پھر یہ روایت ویسے بھی ضعیف ہے۔ شعبی نے اسے قرظہ سے روایت کیا ہے۔ شعبی کی قرظہ سے ملاقات ہی ثابت نہیں نیز مذکورہ روایتوں پر مصنف کتاب حافظ ابن عبدالبرؒ کا اپنا تبصرہ یہ ہے کہ اس طرح کی بعض روایات کا بعض جاہل اہلِ بدعت یہ مطلب لیتے ہیں کہ ان سے حضرت عمرؓ کی حدیث سے بے زاری اور بے نیازی کا علم ہوتا ہے۔ یہ قول حافظ ابن عبدالبرؒ حضرت عمرؓ کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ نومسلم لوگ ابھی قرآن کی تعلیم کے محتاج ہیں اس لیے انہیں ابھی قرآن سیکھنے دو اور ان کے سامنے احادیث کم بیان کرو۔ اس کے بعد حافظ ابن عبدالبرؒ نے نہایت تفصیل سے واضح کیا ہے کہ حضرت عمرؓ قرآن فہمی کے لیے احادیث کو ناگزیر قرار دیتے تھے، لیکن یہ باتیں محمد اسلم جیراج پوری کے خلاف جاتی تھیں اور حافظ ابن عبدالبر کے الفاظ کے مطابق جیراج پوری کا شمار چوں کہ جاہل اہل بدعت میں ہوتا ہے اس لیے بھرپور علمی خیانت کا ارتکاب کرتے ہوئے انہوں نے حافظ ابن عبدالبر کے تبصرے کو نظر انداز کرنے میں ہی عافیت محسوس فرمائی اور یوں اپنے قارئین کو

© rasailojaraid.com

۵۷۔ مقام حدیث: ص ۲۶

© rasailojaraid.com

دھوکے میں رکھنے کی انہوں نے سعی نامشکور فرمائی۔ عنوان ''خلفائے راشدینؓ اور حدیث'' کے تحت حضرت عمرؓ کی طرف سے روایت حدیث اور عمل بالسنّۃ کی جو تاکید ملتی ہے۔ اس طرح کی تمام روایات سے بھی جیراج پوری نے آنکھیں بند کر لیں۔

حضرت عمرؓ کا تقلیل روایت (احادیث کم بیان کرنے) کا حکم بھی مطلق نہیں تھا، بل کہ یہ صرف ان روایات کے متعلق تھا جو قصص وواقعات اور اخبار و حوادث کے بارے میں تھیں لیکن جن روایات کا تعلق شرعی افعال واعمال سے ہے، ان کی روایت سے آپ نے ہر گز منع نہیں فرمایا۔ مسند عبدالرزاق میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے فرمایا اقلّو الروایۃ عن رسول اللہ ﷺ الاّ فیما یُعمل بہ[۵۸] یعنی ''رسول اللہ ﷺ سے روایات کم بیان کرو مگر جو عمل کے متعلق ہیں (انہیں بیان کرو)''۔ حضرت عمرؓ جب مجاہدین اور حکام کو رخصت کرتے تو انہیں یوں نصیحت فرماتے واقلّو الروایۃ عن رسول اللہ ﷺ وانا شریککم فیہ[۵۹] ''رسول اللہ ﷺ سے روایتیں کم بیان کرو اور (ضروری حد تک روایتیں بیان کرنے میں تو) میں بھی تمہارے کام میں شریک ہوں''۔

حضرت عمرؓ کی روایت حدیث کے بارے میں یہ احتیاط اور آپ کا تقلیل روایت پر اصرار نہایت حکیمانہ ہے۔ چناں چہ جن احادیث کا تعلق احکام سے ہے ان پر ائمہ اربعہ اور ان کے متعلق فقہانے اصول روایت ودرایت کے تحت سیر حاصل بحث کی ہے۔ اگر ایسی بعض احادیث سند کے لحاظ سے ضعیف بھی ہیں تو تعاملِ امت سے ان کے متعلق شبہات کالعدم ہو جاتے ہیں۔ امت کے عملی تواتر کے ساتھ ساتھ محدثانہ اصولوں پر بھی ان کی چھان پھٹک ہو چکی ہے۔ اس کے پیش نظر ان پر مزید تحقیق وتنقید کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جن احادیث کا تعلق فضائل اعمال سے ہے ان کے متعلق محدثین کا معیار تنقید وتحقیق اور ردّ و قبول اتنا بلند نہیں ہے جتنا احکام سے متعلق احادیث کے بارے میں اختیار کیا گیا ہے۔ چناں چہ امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے ائمہ جرح وتعدیل فرماتے ہیں اذا روینا فی الحلال والحرام شدّدنا واذا رینا فی الفضائل ونحو ھانتساھلنا[۶۰] ''جب ہم حلال وحرام (احکام) کے بارے میں احادیث کی روایت کرتے ہیں تو (ان کی جانچ پڑتال میں) سختی سے کام

۵۸۔ مسند عبدالرزاق ا:ج ا، ص ۲۶۲

۵۹۔ سنن دارمی: ج ا، ص ۷۳

۶۰۔ علی القاری۔ الموضوعات، ص ۵۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیتے ہیں اور جب ہم فضائل وغیرہ کی احادیث بیان کرتے ہیں تو تساہل سے کام لیتے ہیں"۔ ان میں تساہل کی وجہ یہ ہے کہ خود قرآن کریم سے ثابت ہے کہ نیک اعمال کا اجر و ثواب سب کے لیے یک ساں نہیں۔ ہر نیک عمل کا اجر کم از کم دس گنا اور بعض لوگوں کے لیے اس سے بھی کہیں زیادہ حتیٰ کہ سات سو گنا بل کہ بعض لوگوں کے لیے تو اس سے بھی زیادہ ہے۔ (۶۱) لیکن فضائل اعمال کی احادیث کے پرکھنے میں اس تساہل کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فضائل پر ہر قسم کی احادیث کو محدثین نے قبول کیا ہے۔ چناں چہ عذاب و ثواب میں بیجا مبالغہ آرائی پر مشتمل روایات کو بالاتفاق موضوع قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً یہ روایت کہ جو شخص لا الٰہ الّا اللہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کلمے سے ستر ہزار زبانوں والا ایک پرندہ پیدا فرماتا ہے...... الیٰ آخرہ یا مثلاً "جو شخص غسل جنابت کرے گا اسے اللہ تعالیٰ ہر قطرے کے عوض ہزار شہیدوں کا ثواب عنایت فرمائے گا" وغیرہ، اس طرح کی سب احادیث جھوٹی ہیں۔

جن روایات کا تعلق مغازی و سیر، واقعات و قصص، صحابہ کرامؓ کے مشاجرات اور ان کے متعلق واقعات سے ہے، اگرچہ ان پر بھی اہل علم نے بڑی حد تک بحث و تمحیص کی ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ آج بھی شدید تنقید اور عمیق تحقیق کی محتاج ہیں۔ ایسی اکثر روایات رسول اللہ ﷺ سے منقول ہی نہیں بل کہ صحابہ کرامؓ و تابعین وغیرہ سے مروی ہیں اور ان پر لفظ "حدیث" کا اطلاق توسعاً (حدیث کے اصطلاحی مفہوم میں وسعت پیدا کرتے ہوئے) کر دیا جاتا ہے اور جو اس طرح کی روایات تاریخ کی کتب میں ہیں وہ اکثر و بیشتر محدثانہ معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ اسی طرح کی روایات کے متعلق حضرت عمرؓ نے تقلیل روایت کی تاکید فرمائی تھی کیوں کہ ایسی غیر معتبر اور اکثر صورتوں میں کتاب و سنت سے معارض روایات سے امت میں اختلاف وانتشار اور فرقہ بندی کی راہ ہم وار کرنا دراصل طاغوت کی خدمت ہے گو کوئی اسے غیر شعوری طور پر دین کی خدمت سمجھنے کے فریب میں مبتلا ہو۔

الغرض حضرت عمرؓ کی تقلیل روایت کے متعلق تاکید کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ (معاذ اللہ) حجیت حدیث اور اس کی ضرورت واہمیت کے منکر تھے چناں چہ حافظ ابن عبد البرؒ نے اپنے تبصرے میں بہت سی مثالوں سے واضح کیا ہے کہ حضرت عمرؓ حدیث کو حجت سمجھتے تھے اور آخر میں آپ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: سیأتی قوم یجادلونکم بشبہات القرآن فخذوھم بالسنن فان

۶۱۔ البقرۃ: ۲۶۱۔ الانعام: ۱۶۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصحاب السنن اعلم بکتاب اللہ عزّ و جل[۶۲] "عن قریب ایسے لوگ آئیں گے جو تم سے قرآن کی متشابہ آیات کے ساتھ جھگڑا کریں گے سو تم ان ہی سُنن (احادیث) کے ذریعے پکڑو، کیوں کہ اہل سنن ہی اللہ عزوجل کی کتاب کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں"۔ منکرین حدیث کی طرف سے یہ سب کچھ چھوڑ دینا کیا بدترین علمی خیانت نہیں ہے؟

۴۔ "مقام حدیث" میں ہے "حضرت عمرؓ روایت کے معاملے میں اتنے سخت تھے کہ ابی بن کعب کو جب حدیثیں سناتے دیکھا تو درہ لے کر ان کو مارنے کے لیے تیار ہو گئے"۔[۶۳]

تبصرہ

یہاں بھی حسب عادت محمد اسلم جیراج پوری نے جھوٹ اور فریب سے کام لیا ہے۔ اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں: قال ابن عیینہ: رأی عمر بن الخطاب مع ابی جماعة فعلا بالدرة قال ابی: اعلم ما تصنع یرحمك اللہ، قال عمر: اما علمت انها فتنة للمتبوع مذلة للتابع[۶۴] یعنی "ابن عُیینہ کہتے ہیں کہ عمرؓ بن خطاب نے ابیؓ کو ایک جماعت کے ساتھ دیکھا تو آپ نے (ابی کے سر پر) درہ بلند کیا۔ ابیؓ نے عرض کیا، اللہ آپ پر رحم فرمائے مجھے بھی تو پتہ چلے یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ کیا تم جانتے نہیں کہ تمھاری یہ حالت متبوع (یعنی تمھارے لیے) فتنہ ہے اور تابع (پیچھے آنے والوں) کے لیے باعث ذلت ہے" یعنی جس امتیازی شان کے ساتھ حضرت ابیؓ بن کعب جماعت کے آگے آگے چل رہے تھے تو ان کی یہ ادا حضرت عمرؓ کو پسند نہ آئی۔ یہاں احادیث کی روایت کا دور دور تک کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

۵۔ طاہر بن صالح الجزائری کی کتاب "توجیہ النظر" سے ایک روایت " مقام حدیث" میں یوں نقل کی گئی ہے " بیان کیا گیا ہے کہ (حضرت عمرؓ نے) عبد اللہ بن مسعودؓ، ابو الدرداءؓ اور ابوذرؓ کو ڈانٹا کہ تم

۶۲۔ ابن عبد البر جامع بیان العلم: ج ۲، ص ۱۲۳

۶۳۔ مقام حدیث: ص ۷۷

۶۴۔ تذکرۃ الحفاظ: ج ۱، ص ۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ کیا روایتیں رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے رہتے ہو؟۔ پھر ان کو مدینے میں نظر بند رکھا اور جب تک زندہ رہے کہیں جانے کی اجازت نہیں دی"۔[۶۵]

تبصرہ

یہاں بھی حافظ محمد اسلم جیراج پوری دجل وفریب سے باز نہ رہ سکے اور کتاب کے مصنف طاہر بن صالح الجزائری کا اس روایت پر یہ تبصرہ سرے سے نظر انداز کر گئے: ھذا مرسل مشکوك ولا یجوز الاحتجاج به ثم ھو فی نفسه ظاہر الکذب[۶۶] "یہ روایت مُرسل اور مشکوک ہے، اس سے دلیل پکڑنا درست نہیں۔ پھر اس کا فی نفسہ جھوٹ ہونا بھی بالکل ظاہر ہے"۔

۶۔ منکرین حدیث کی کتاب "مقام حدیث" میں ہے "چناں چہ اکثر صحابہؓ سے بہت سی روایتوں کے قبول کرنے میں توقف ثابت ہے جس سے ان لوگوں نے دلیل پکڑی ہے جو حدیثوں کو دینی حجت نہیں مانتے"۔

تبصرہ

یہ مضمون بھی الجزائری کی کتاب "توجیہ النظر" کا ہے اور اس کے آخر میں کتاب کے مصنف نے لکھا ہے: قد استدل بذالك من یقول بعدم الاعتماد فی امر الدین وقد ردّ علیھم الجمھور[۶۷] "ان باتوں سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو حدیث کو دین میں حجت نہیں سمجھتے حال آں کہ جمہور علما نے ان کی اس بات کو مردود قرار دیا ہے"۔ یہاں بھی جیراج پوری صاحب نے پوری عبارت نہ لکھ کر اور اس کے آخری حصے کو چھوڑ کر علمی خیانت سے کام لیا ہے۔

۷۔ اوپر "خلفائے راشدینؓ اور حدیث" کے عنوان کے تحت بہ خوبی واضح کیا جا چکا ہے کہ خلفائے راشدینؓ سے سیکڑوں احادیث مروی ہیں۔ وہ سنت رسول کے ساتھ تمسک کرتے تھے اور اسے شریعت کا اہم ماخذ سمجھتے تھے۔ اس طرح کی تمام روایات کو نظر انداز کرنا اور بعض جھوٹی اور کم زور روایات

۶۵۔ مقام حدیث: ص ۷۷
۶۶۔ طاہر بن صالح الجزائری۔ توجیہ النظر: ص ۱۸
۶۷۔ ایضاً: ص ۱۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا سہارا لینا علمی بددیانتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق "مقام حدیث" میں لکھا ہے کہ آپ نے پانچ سو احادیث لکھ رکھی تھیں پھر آپ نے ان کو جلا دیا"۔ (۶۸)

تبصرہ

امام ذہبیؒ نے تذکرہ الحفاظ میں اس روایت کے بعد یہ بھی لکھا ہے فھذا لا یصح (۶۹) "یہ روایت صحیح نہیں ہے" اسے چھوڑ دینا علمی خیانت ہے۔ نیز اس روایت کے ایک راوی موسیٰ عبداللہ بن حسن کے متعلق امام بخاریؒ نے لکھا ہے "فیہ نظر "یعنی یہ غیر معتبر اور مشکوک راوی ہے۔ (۷۰) دوم راوی علی بن صالح مجہول الحال ہے (۷۱) ایک اور راوی محمد بن موسیٰ غیر معتبر ہے۔ (۷۲)۔

حضرت عمرؓ کے متعلق "مقام حدیث" میں لکھا ہے کہ احادیث کی کتابت کے لیے آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ آپ کی مجلس شوریٰ نے گو احادیث کو لکھنے کے حق میں مشورہ دیا لیکن پھر بھی ایک ماہ تک استخارہ کرنے کے بعد آپ نے یہ ارادہ چھوڑ دیا ہے۔ (۷۳)

تبصرہ

اسلم جیراج پوری صاحب یہاں بھی دھوکے اور فریب سے باز نہ آئے۔ جامع بیان العلم میں ہی یہ روایت بھی موجود ہے جسے انہوں نے ناحق چھوڑ دیا: عن عبد الملک بن سفیان عن عمہ انہ سمع عمر بن الخطاب یقول قیدو العلم بالکتاب (۷۴) "عبدالملک بن سفیان اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عمرؓ بن خطاب کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ علم (حدیث) کو لکھ کر محفوظ کرو"۔ اگر حدیث کو اصحاب رسول حجت نہ سمجھتے ہوتے تو حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ آپ کو کتابت حدیث کے حق میں رائے کیوں دیتی؟ اگر حضرت عمرؓ حدیث کو حجت نہ سمجھتے ہوتے تو ایک ماہ تک استخارہ کیوں کرتے

۶۸۔ مقام حدیث: ص ۹۱

۶۹۔ تذکرۃ الحفاظ: فھذا لا یصح" بعد ھذہ الروایۃ

۷۰۔ ذہبی۔ میزان الاعتدال: ج ۴، ص ۲۱۱۔ ابن حجر عسقلانی۔ لسان المیزان: ج ۶، ص ۱۲۳

۷۱۔ تقریب التھذیب: ص ۲۴۶

۷۲۔ لسان المیزان

۷۳۔ مقام حدیث ص ۹۲

© rasailojaraid.com

۷۴۔ جامع بیان العلم: ج ۱، ص ۷۲

© rasailojaraid.com

رہتے ؟استخارے کی دعا اور طریقہ نیز اس کا حکم قرآن میں تو کہیں مذکور نہیں ۔ نیز حضرت عمرؓ نے خود احادیث کیوں لکھ رکھی تھیں جو ان کے خاندان میں منقول ہوتی چلی آئیں جن کی نقل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی کروائی تھی اور اس پر عمل کروایا تھا۔ (۷۵) محدث دار قطنیؒ نے اس کے راویوں کو ثقہ اور معتبر قرار دیا ہے۔ خود حضرت عمرؓ سے کتب حدیث میں روایات موجود ہیں۔ مذکورہ روایت حضرت عروہ بن زبیر سے مروی ہے، انہوں نے حضرت عمرؓ کا زمانہ نہیں پایا اور نہ ہی حضرت عمرؓ سے ان کی ملاقات ثابت ہے، لہٰذا روایت منقطع ہے۔ بہ لحاظ درایت بھی یہ روایت ناقابل اعتماد اور غیر معتبر ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں تو قرآن کریم کی سورتوں کے ساتھ آخری تدوین اور اشاعت نہیں ہوئی تھی، یہ کام حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ہوا۔ حضرت عمرؓ استخارہ فرماتے تو قرآن کریم کی تدوین واشاعت کو مقدم رکھتے ہوئے اس کے متعلق استخارہ فرماتے۔ اگر روایت صحیح بھی ہو تو حضرت عمرؓ کا یہ اقدام نہایت مناسب ہے۔ کلام اللہ (وحی کتاب) کی تدوین واشاعت مقدم اور حدیث (وحی غیر کتاب اور کلام رسول) کی تدوین واشاعت واقعی مؤخر ہونی چاہیے اسی لیے روایت کے آخر میں یہ کلمات ہیں "پہلی قومیں اس لیے ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی حدیثیں لکھیں پھر ان ہی پر جھک پڑے اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا"۔ (۷۶) یہود ونصاریٰ نے تورات وانجیل میں بھرپور تحریف کی، جو اقوام اللہ کے کلام کی حفاظت نہ کر سکیں وہ پیغمبروں کی احادیث کی حفاظت بھی بھلا کیسے کر سکتی تھیں۔ پس کلام اللہ (قرآن کریم) کی تدوین واشاعت کو حضرت عمرؓ نے مقدم رکھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ قرآن کی حفاظت کو تو ضروری سمجھتے تھے لیکن بیان قرآن (سنّت) سے بے نیاز تھے۔

احادیث کو مٹانے کے سلسلے میں یحییٰ بن جعدہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے احادیث کے لکھنے کا ارادہ فرمایا۔ پھر ان کی رائے یہ ہوئی کہ انہیں نہ لکھا جائے تو آپ نے شہروں کی طرف والا نامہ بھیجا کہ جس کے پاس حدیث ہو تو وہ اسے مٹا ڈالے۔ یحییٰ بن جعدہ نے حضرت عمرؓ کا زمانہ نہیں پایا۔ نیز اگر حضرت عمرؓ نے ایسا کوئی خط شہروں کی طرف بھیجا ہوتا تو خود حضرت عمرؓ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ کیوں تھا؟ نیز دیگر بیسیوں صحابہ کرام کے پاس احادیث کے وہ صحائف کہاں سے آ گئے تھے جن سے وہ لوگوں کو احادیث کی تعلیم دیتے تھے اور انہیں ان کے شاگرد نقل بھی کرتے تھے۔

© rasailojaraid.com

۷۵۔ دار قطنی: ص ۱۱۰

۷۶۔ مقام حدیث: ص ۹۲

© rasailojaraid.com

قاسم بن محمد سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں احادیث کی کثرت ہو گئی تو آپ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر کہا یہ حدیثیں میرے پاس لائی جائیں۔ یہ احادیث آپ کے پاس لائی گئیں تو آپ نے انہیں جلانے کا حکم دیا"۔(۷۷) قاسم بن محمد کی پیدائش حضرت عمرؓ کی وفات کے انیس سال بعد ہوئی، لہٰذا یہ روایت قابل احتجاج نہیں ہے۔ اس طرح کی روایات کو صحیح بھی سمجھا جائے تو دیگر روایات سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے دو بڑے مقاصد تھے۔ ایک مقصد یہ تھا کہ ایک ہی صحیفے میں قرآن کریم اور احادیث کو یک جا نہ کیا جائے۔ چناں چہ آپ کا ارشاد ہے و اللّٰہ لا البسنّ کتاب اللّٰہ بشئی ابداً(۷۸) "اللہ کی قسم! میں کبھی بھی کتاب اللہ کے ساتھ کسی اور چیز کو خلط ملط نہیں ہونے دوں گا"۔

حضرت عمرؓ کا دوسرا بڑا مقصد یہ تھا کہ جن احادیث کا تعلق شرعی اعمال و افعال سے ہے انہیں تو ضرور بیان کیا جائے لیکن جن کا تعلق قصص و واقعات اور تاریخی اخبار و روایات سے ہے انہیں کم بیان کیا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی روایات واقعی آج بھی عمیق تحقیق کا تقاضا کرتی ہیں۔ اسی لیے تو حضرت عمرؓ کا اصرار تھا کہ جن روایات کا تعلق مسلمانوں کی عملی زندگی سے ہے ان ہی پر زیادہ توجہ دی جائے، ورنہ وہ ہرگز حجیت حدیث کے منکر نہیں تھے۔ الغرض اگر حضرت عمرؓ نے کچھ احادیث ضائع کرائی بھی ہوں یا انہیں جلا دیا ہو تو ان کا یہ اقدام حالات کے مطابق مناسب تھا اس کا یہ مطلب لینا ہرگز درست نہیں کہ وہ سنتِ رسول کو (معاذ اللہ) سرے سے حجت ہی نہیں سمجھتے تھے، چناں چہ حضرت عثمانؓ کے دور میں قرآن کریم کی تدوین و اشاعت کے بعد لوگوں کے پاس پہلے سے موجود قرآن کریم کے لاتعداد نسخے ضائع کرائے گئے تھے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کریم بھی (معاذ اللہ) حجت نہیں ہے۔ احادیث کے بعض مجموعے بالفرض خلفائے راشدینؓ نے ضائع بھی کرائے ہوں تو اس کا مقصد یہی تھا کہ ہر شخص اس کام کا اہل نہیں۔ کہیں بے احتیاطی سے رسول اللہ ﷺ کی طرف غلط روایات منسوب نہ ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے تقلیل روایت کا مقصد بھی یہی تھا جیسا کہ ہم اوپر نکتہ نمبر ۴ میں اسے خوب واضح بھی کر چکے ہیں۔

© rasailojaraid.com

۷۷۔ مقام حدیث: ص ۸

۷۸۔ السیوطی، تدریب الراوی، ج ۲، ص ۶۸

© rasailojaraid.com

حضرت علیؓ کے متعلق منکرین حدیث کی کتاب "مقام حدیث" میں لکھا ہے کہ آپ نے لوگوں کو احادیث کے مٹانے کا حکم دیا اور فرمایا "گذشتہ اقوام اسی وجہ سے تباہ ہوئیں کہ انہوں نے اپنے علماء کی روایات کی پیروی کی اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا"۔ (۷۹)

تبصرہ

دیکھیے یہاں "احادیث الرسول" کی بات نہیں ہو رہی بل کہ احادیث العلما کی بات ہو رہی ہے۔ خود حضرت علیؓ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے بر سر منبر اعلان فرمایا کہ کوئی ہے جو ایک درہم کے کاغذ خرید لائے تو میں اسے ان اوراق پر علم لکھ دوں۔ چناں چہ حارث اعور ایک درہم کے کاغذ خرید کر لایا اور آپ نے ان اوراق پر بہت سی احادیث لکھ دیں۔ (۸۰)

۸۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا مگر شکار کا کتا یا بکریوں کا کتا اور جانوروں کی حفاظت کا کتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ حضرت ابوہریرۃؓ تو کھیت کے کتے کا بھی ذکر کرتے ہیں تو ابن عمرؓ نے فرمایا: ان لابی ھریرۃ زرعا (۸۱) "بے شک ابوہریرۃؓ کے پاس کھیت بھی ہیں"۔ اس کے متعلق منکرین حدیث کی طرف سے یہ تاثر پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ابن عمرؓ کی حضرت ابوہریرۃؓ پر لطیف طنز ہے کہ کھیتی کے کتے کو قتل کیے جانے سے مستثنیٰ قرار دینا (معاذ اللہ) حضرت ابوہریرۃؓ کا اپنی طرف سے اضافہ ہے کیوں کہ ان کی کھیتی بھی ہے۔ حال آں کہ کھیتی کے کتے کو مستثنیٰ قرار دینے کی روایت صحیح بخاری میں حضرت سفیان بن ابی زہیر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ (۸۲) اور صحیح مسلم میں یہ روایت نہ صرف حضرت شعبہ اور حضرت سفیان بن ابی زہیر سے مروی ہے بل کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک حدیث میں بھی کھیتی کے کتے کو مار ڈالنے کے حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ (۸۳) پس جس روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کھیتی کے کتے کا ذکر نہیں کیا تو لوگوں کے یاد دلانے اور حضرت ابوہریرہؓ کا حوالہ دینے پر جو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ہاں، ابوہریرہؓ کا

۷۹۔ مقام حدیث: ص ۹۲

۸۰۔ طبقات ابن سعد: ج ۶، ص ۱۱۶

۸۱۔ مسلم: کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب الامر بقتل الکلاب

۸۲۔ بخاری: ماجاء فی الحرث والمزارعۃ

۸۳۔ مسلم: کتاب المساقاۃ والمزارعۃ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھیت بھی ہے تو اس سے انہوں نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ کھیتی کے کتے کا قتل کئے جانے سے مستثنیٰ ہونا مجھے اس لیے مستحضر نہ رہا کہ میری کھیتی نہیں جب کہ ابوہریرہؓ کی کھیتی ہے، چناں چہ دوسرے مواقع پر انہوں نے اپنی روایت میں کھیتی کے کتے کا بھی ذکر فرمایا۔ اس کے علاوہ حضرت شعبہ اور حضرت سفیان بن زہیر رضی اللہ عنہما کی روایات بھی اس کی بہ خوبی تائید و توثیق کر رہی ہیں۔ منکرین حدیث ان باتوں سے بے خبر نہیں ہو سکتے لیکن صحیح حقائق کو چھپا کر قارئین کو دھوکہ دینا دیگر اہل باطل کی طرح ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ روافض کی طرح اسلم جیراج پوری کو بھی حضرت ابوہریرہؓ کی کثرت روایات پر اعتراض ہے اور کتب حدیث میں موجود ان کی ۵۳۷۴، احادیث کو انہوں نے غیر معتبر قرار دیا ہے۔[۸۴] یہاں بھی وہ حسب عادت دھوکے اور فریب سے کام لے رہے ہیں۔ ان احادیث کی یہ تعداد مختلف طُرق اسناد کی بنا پر ہے۔ احادیث کے صرف متون کو لیا جائے اور تکرار روایت کو حذف کیا جائے تو یہ تعداد دو ہزار تک بھی بہ مشکل پہنچے گی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے ۷ ہجری میں فتح خیبر کے ایام میں اسلام قبول کیا۔ وہ اصحاب صُفّہ میں شامل رہے۔ ان کی زندگی کا اہم نصب العین ہی یہی تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو یاد کریں اور انہیں آگے منتقل کریں۔ اسی مقصد کے لیے انہوں نے آپ سے ضعفِ حافظہ کے ازالے کے لیے دعا کی درخواست کی تھی تو آپ نے خصوصی توجہ فرمائی۔[۸۵] اگر دس بارہ سال کا بچہ جس کی مادری زبان عربی نہ ہو پھر بھی وہ دو تین سالوں میں قرآن کریم کی چھ ہزار سے زائد آیات حفظ کر لیتا ہے تو حضرت ابوہریرہؓ نے ۷ ہجری سے اوائل ۱۱ ہجری تک رسول اللہ ﷺ کی صحبت کا زمانہ پایا تو وہ کیوں دو ہزار کے قریب احادیث کو یاد نہیں رکھ سکتے تھے؟۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں ”کہ تم خیال کرتے ہو کہ ابوہریرہ رسول اللہ ﷺ سے بہت سی احادیث بیان کرتا ہے۔ اللہ کی قسم! میں تو ایک مسکین شخص تھا اور صرف اپنا پیٹ بھر کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرنے کے سوا اور میرا کوئی کام نہ تھا: وکان المہاجرون یشغلہم الصفق بالاسواق وکانت الانصار یشغلہم القیام علی اموالہم فقال رسول اللہ ﷺ من یبسط ثوبہ فلن ینسی شیئا سمعہ منی فبسطت ثوبی حتی قضی حدیثہ ثم ضممتہ الی فما نسیت شیئًا سمعتہ منہ۔[۸۶]“ اور مہاجرین کو بازار کے کاروبار سے فرصت نہیں

۸۴۔ مقام حدیث: ص ۸۲

۸۵۔ جمع الفوائد: ج ۱، ص ۴۳۲، رقم ۲۹۵ عن ابی ہریرۃ

۸۶۔ [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی اور انصار اپنے اموال کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص اپنا کپڑا بچھادے وہ مجھ سے جو بات بھی سنے گا بھولے گا نہیں۔ تو میں نے اپنا کپڑا بچھادیا یہاں تک کہ آپ حدیث بیان فرما چکے پھر میں نے اس کپڑے کو اپنے سینے سے لگالیا۔ پس (اس کا اثر یہ ہوا کہ) میں نے آپ سے جو بات بھی کبھی سنی تو اسے کبھی نہیں بھولا"۔ اس روایت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ حضرت ابوہریرہؓ کی کثرت روایت کا تذکرہ کرتے تھے تو انہیں حضرت ابوہریرہؓ کی یادداشت پر تعجب ہوتا تھا نہ یہ کہ وہ (معاذ اللہ) کسی بدگمانی سے کام لیتے تھے جیسا کہ منکرین حدیث باور کرانا چاہتے ہیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حضرت ابوہریرہؓ کے مضبوط حافظے اور ان کی کثرت روایت پر تعجب مہاجرین وانصار کو نہیں تھا وہ تو ان کے حالات کو پہلے سے ہی جانتے پہچانتے تھے۔ چناں چہ اس روایت میں حضرت ابوہریرہؓ مہاجرین اور انصار کو اپنا حال بیان نہیں فرما رہے ہیں بل کہ ان کے علاوہ اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے مہاجرین وانصار کا حال بیان فرما رہے ہیں کہ مہاجرین کو بازار میں کاروبار سے اور انصار کو اپنے اموال کی دیکھ بھال سے فرصت کم ملتی تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث سننے کا موقع مجھے مہاجرین اور انصار کی نسبت زیادہ حاصل تھا۔ ان احادیث کو اپنے حافظے میں محفوظ رکھنے کے متعلق انہوں نے فرمایا کہ اس میں ان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص دعا اور آپ کے معجزے کا دخل ہے۔ منکرینِ حدیث کا یہ تاثر قائم کرنا قطعاً غلط اور سراسر خلافِ حقیقت ہے کہ صحابہ کرامؓ عموماً اور مہاجرین وانصار خصوصاً حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کو (معاذ اللہ) مشتبہ قرار دیتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی طرف سے بہ کثرت احادیث بیان کرنے پر تعجب مہاجرین وانصار کو نہیں بل کہ ان کے بعد آنے والے اور لوگوں کو تھا۔ چناں چہ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: یقولون ما بال المہاجرین والانصار لا یتحدثون مثل احادیثہ (۸۷)" یہ لوگ کہتے ہیں کہ مہاجرین وانصار کو کیا ہوا کہ وہ اس (ابوہریرہؓ) کی طرح بہ کثرت احادیث روایت نہیں کرتے، حضرت ابوہریرہؓ پر مہاجرین و انصار کو کوئی اعتراض ہوتا تو ان کا قول ان الفاظ میں منقول ہوتا: مابالنا لانتحدث مثل احادیثہ "ہمیں کیا ہوا کہ ہم بھی ابوہریرہؓ کی طرح بہ کثرت احادیث بیان نہیں کرتے"۔ پس منکرین حدیث کا اس سلسلے میں لوگوں کو فریب دینا بالکل واضح اور ظاہر و باہر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۹۔ حافظ ابن عبدالبرؒ کی کتاب جامع بیان العلم میں فضیل بن عیاض کے متعلق روایت لکھی ہے کہ لوگوں کی ایک جماعت ان کے دروازے پر پہنچی تو آپ نے انہیں اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔ راوی ابن الخواری کا بیان ہے کہ یہ صرف قرآن کی تلاوت کی آواز سن کر باہر آتے ہیں تو ہم نے قاری سے قرآن پڑھنے کو کہا تو وہ پڑھنے لگا۔ اس پر آپ نے کھڑکی سے جھانکا تو ہم نے کہا، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، انہوں نے کہا وعلیکم السلام۔ ہم نے کہا، اے ابوعلی (یہ آپ کی کنیت ہے) آپ کیسے ہیں اور آپ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو خیریت سے ہوں اور تمھاری طرف سے تکلیف میں ہوں۔ یہ طریقہ تم نے اسلام میں نیا بنا لیا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہم اس طرح علم نہیں سیکھتے تھے۔ چناں چہ ہم ان طالب علموں کے نیچے یا پیچھے بیٹھ جاتے تھے اور غور سے سنتے رہتے ور جب کوئی حدیث بیان ہو چکتی تو ہم دوسروں سے اس کا اعادہ کرتے اور اس حدیث کو محفوظ کر لیتے اور تم علم کو جہالت کے ساتھ طلب کرتے ہو اور تم نے کتاب اللہ کو ضائع کر دیا ہے۔ اگر تم کتاب اللہ طلب کرتے تو تم اس میں شفا پاتے۔ ہم نے کہا کہ ہم نے قرآن سیکھ لیا ہے۔ فرمایا وہ ایسی کتاب ہے جو تمہیں اور تمھاری اولادوں کے لیے کافی ہے۔ ہم نے کہا، کیسے ابوعلی؟ فرمایا، قرآن کو ایسے سیکھو کہ تم اس کے اعراب کو پہچانو اور اس کے محکمات کو متشابہات سے اور ناسخ کو منسوخ سے پہچانو۔ جب تم نے یہ سب کچھ پہچان لیا تو تم فضیل اور ابن عیینہ کے کلام سے بے نیاز ہو جاؤ گے پھر یہ آیت پڑھی: يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ[۸۸] ”اے لوگو! بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کے لیے شفا اور مومنین کے لیے ہدایت اور رحمت آچکی تو کہہ کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے یہ نعمت ملی ہے تو لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس پر خوش ہو جائیں وہ اس سے بہتر ہے جسے لوگ جمع کر رہے ہیں“۔[۸۹] مذکورہ روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فضیلؒ بن عیاضؒ کا واسطہ بدتمیز قسم کے لوگوں سے پڑا تھا۔ فضیل بن عیاضؒ روایتِ حدیث اور حجیت حدیث کے ہرگز منکر نہیں تھے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ شاگرد جس طرح حدیث سیکھنے کے آداب سے نابلد ہیں تو انہوں نے قرآن بھی کیا سیکھا ہوگا۔ محمد اسلم جیراج پوری نے یہاں بھی حسب عادت دھوکے اور فریب سے کام

© rasailojaraid.com

۸۸۔ یونس:۵۸

۸۹ مسلم: فضائل الصحابۃ

© rasailojaraid.com

لیتے ہوئے من پسند انداز میں خوب قطع و برید کرتے ہوئے اسے اس طرح پیش کیا ہے گویا حضرت فضیل بن عیاض حدیث سے نالاں اور بے نیاز تھے اور اسے دینی حجت نہیں سمجھتے تھے۔ اس طرح کی روایات جامع بیان العلم میں ہے امام شعبہ اور سفیان بن عیینہ کے متعلق بھی ہیں اب سب کے متعلق کتاب کے مصنف حافظ ابن عبدالبرّ کا اپنا تبصرہ یہ ہے: ھذا کلام خرج علیٰ فجر وفیہ لأولی العلم نظر[90] "یہ کلام ایسا ہے جو (بدتمیز شاگردوں کی وجہ سے) ان ائمہ کی زبان سے اکتاہٹ اور بے چینی کی وجہ سے نکلا ہے اور ان کی طرف منسوب ایسا کلام اہل علم کے نزدیک ویسے بھی (باعتبار سند) مشکوک اور غیر معتبر ہے"۔ ایسی تمام عبارتوں کو جیراج پوری صاحب نے چھوڑ دیا ہے۔ نیز سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ کی طرف منسوب ان اقوال کی سند میں اسحٰق بن ابرہیم بن نعمان، محمد بن علی بن مروان، محمد بن سلیمان بن ابی الشریف اور زکریا قطان مجہول ہیں جب کہ علی بن جمیل کذاب ہے۔

۱۰۔ حافظ ابن عبدالبرّ کی اسی کتاب جامع بیان العلم میں داؤد طائی کے متعلق روایت ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ حدیث بیان نہیں کرتے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے اس کام سے کیا دل چسپی ہوسکتی ہے کہ میں بچوں کو احادیث لکھواؤں اور پھر وہ صرف میری لغزشوں پر نظر رکھیں: فاذا قاموا من عندی یقول قائل منھم اخطأ فی کذا ویقول الاٰخر غلط فی کذا، أتریٰ عندی شیئا لیس عند غیری پھر جب وہ میرے پاس سے چلے جاتے ہیں تو ان میں سے ایک کہنے والا کہتا ہے کہ اس (داؤد طائی) نے فلاں جگہ خطا کی اور دوسرا کہتا ہے اس نے فلاں جگہ غلطی کی، میرے پاس کون سی ایسی چیز ہے جو دوسروں کے پاس نہیں"۔ اس سے اگلی روایت اس کتاب میں یہ ہے کہ داؤد طائی سے پوچھا گیا: کم تلزم بیتك الّا تخرج؟ قال اکرہ ان احمل رَحلی فی غیر حقّ[91] "آپ کب تک گھر میں مقیم رہیں گے کیا آپ نکلیں گے نہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں پسند نہیں کرتا کہ اس راہ پر چلوں جو حق کے خلاف ہو"۔ ان دونوں روایتوں کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد طائی کا واسطہ بھی اپنے بعض نااہل، بدتمیز اور بے ادب شاگردوں سے پڑا تھا نہ یہ کہ وہ روایت حدیث اور حجیت حدیث کے منکر تھے۔ لیکن محمد اسلم جیراج پوری نے حسب عادت دھوکہ اور فریب دینے کے لیے "مقام حدیث" میں پہلی روایت کو چھوڑ کر صرف دوسری روایت لکھی۔

© rasailojaraid.com

۹۰۔ ابن عبدالبر۔ جامع بیان العلم: ج ۲، ص ۱۲۸، ۱۲۹

۹۱۔ جامع بیان العلم: ج ۲، ص ۱۶۸

© rasailojaraid.com

۱۱۔ قرآن کریم (وحی متلو) کے کلمات اور معانی دونوں اللہ کی طرف سے ہیں اس لیے یہ کلام اللہ ہے حدیث (وحی غیر متلو) کے معانی اللہ کی طرف سے ہیں اور کلمات بیشتر صورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور بعض صورتوں میں حضرت جبرائیل کے ہیں۔ پس وحی غیر متلو اگرچہ وحی ہے لیکن اس کے باوجود یہ خالق کا نہیں بل کہ مخلوق کا کلام ہے۔ خالق کے کلام کے ساتھ مخلوق کے کلام کو باہم ملا جلا دینا اور دونوں میں فرق ملحوظ نہ رکھنا نامناسب ہے۔ بعض صحابہ کرامؓ نے قرآنی آیات کے ساتھ احادیث بھی لکھ رکھی تھیں اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ہم نے جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا اسے بیٹھے لکھ رہے تھے کہ آپ تشریف لائے اور فرمایا کہ تم کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ جو کچھ آپ سے سنتے ہیں، تو آپ نے فرمایا: أکتاب مع کتاب اللہ امحضوا کتاب اللہ و اخلصوہ قال فجمعنا ما کتبنا ثم احرقنا[۹۲] "کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ اور کتاب لکھی جارہی ہے۔ کتاب اللہ کو علیحدہ کرکے لکھو اور اسے خالص رکھو، پس ہم نے جو کچھ لکھا تھا اسے اکٹھا کرکے جلا دیا"۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے ہی صحیح مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے قرآن کے سوا اور کچھ نہ لکھو۔ اگر کسی نے قرآن کے سوا مجھ سے کچھ اور لکھا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے مٹا دے: وحدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علی متعمدا فلیبسوا معقدہ من النار۔[۹۳] "اور میری احادیث کو بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے"۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ان احادیث سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کتابت حدیث کی ممانعت صرف اس صورت میں ہے جب اسے قرآن کے ساتھ ملا کر اس طرح لکھا جائے کہ خالق و مخلوق کا کلام خلط ملط ہو جائے۔ اگر حدیث حجت نہ ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف اس کی کتابت سے بل کہ اس کی روایت سے بھی مطلقاً منع فرما دیتے۔ محمد اسلم جیراج پوری نے قارئین کو فریب دینے کے لیے یہ دعوی کر دیا "آپ نے اس (حکم) پر کوئی علت بیان نہ فرمائی تھی اور بلا کسی قید کے مطلقاً ممانعت فرمائی تھی۔ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مقصد تھا کہ قرآن و حدیث مخلوط نہ ہونے پائیں تو فرما سکتے تھے کہ دونوں کو الگ الگ رکھو۔ اس لیے محدثین کی توجیہ صحیح نہیں ہے"۔[۹۴] حال آں کہ مسند امام احمد میں حضرت ابو

۹۲۔ مسند احمد: ج ۳، ص ۱۲
۹۳۔ مسلم: ج ۲، ص ۴۱۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سعید خدریؓ سے مروی روایت میں یہ توجیہ خود رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ کسی اور چیز کو نہ ملاؤ۔ اسے خالص کر کے اور علیحدہ رکھ کر لکھو۔ نیز آپ نے یہ جو فرمایا: حدثو اعنی و لا حرج "میری طرف سے احادیث بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں"۔ اسے بھی جیراج پوری نے در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ ان مباحث میں حفاظت و کتابت حدیث کے تحت مضامین میں بتایا جا چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے حکم سے ارد گرد کے حکمرانوں کو خطوط لکھوائے۔ اپنے حکم سے میثاق مدینہ، صلح نامہ حدیبیہ، زکوٰۃ و صدقات کے احکام، ایک رجسٹر میں پندرہ سو حضرات کے نام اور دیگر کئی مسودات لکھوائے۔ آپ نے متعدّد صحابہ کو احادیث لکھنے کی ترغیب دی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت کے مطابق صرف حضرت عبداللہ ہی نہیں بل کہ ان کے ساتھ متعدّد دوسرے اصحاب بھی رسول اللہ ﷺ کے روبرو آپ کی احادیث لکھا کرتے تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے جو احادیث لکھ رکھی تھی وہ انہوں نے آپ پر پیش بھی کی تھیں اور تصحیح و تصویب کرائی تھی۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ نماز کا تشھد، دعائے استخارہ اور دیگر ادعیہ واذکار وغیرہ آپ اپنے اصحاب کو ایسے ہی سکھاتے تھے جیسے قرآن کی سورت سکھاتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس جھوٹ اور فریب سے حسب عادت کام لیتے ہوئے جیراج پوری نے لکھا ہے "ان احادیث سے نہ تو کہیں یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور نے ان کی تصدیق فرمائی تھی اور نہ ہی وہ بعد میں اپنی شکل میں موجود ہیں لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ امت کو دیا تھا وہ قرآن تھا۔ احادیث کا کوئی مجموعہ رسول اللہ ﷺ نے امت کو نہیں دیا"۔ (۹۵)

رسول اللہ ﷺ نے ہرگز ہرگز قرآن کریم کا بھی کوئی یک جا مدوّن و مرتب نسخہ جمع کرا کر صحابہ کرامؓ کے حوالے نہیں فرمایا تھا۔ قرآن وحی کتاب ہے اس لیے اس کی کتابت کا آپ نے خاص اہتمام ضرور فرمایا تھا جب کہ حدیث وحی غیر کتاب ہے جس کا مکتوبی ہونا فی نفسہ ضروری نہیں۔ اس کے باوجود قرآن کریم کے علاوہ احادیث کا جو ذخیرہ متعدّد صحابہ کرامؓ نے لکھ رکھا تھا وہ مجموعی حیثیت سے کمیت اور حجم کے اعتبار سے منتشر اور متفرق اجزا پر لکھی گئی قرآنی آیات سے کسی بھی صورت میں کم نہیں تھا اور نہ صحابہ کرامؓ کے پاس احادیث کے صحائف موجود نہ ہوتے۔ صدری حفاظت کے علی الرغم جہاں تک قرآن کی صرف کتابت کا تعلق ہے تو جس طرح مکتوبی صورت میں قرآن کریم کو صرف اور صرف صحابہ کرامؓ نے ہی امت تک پہنچایا ہے کیوں کہ خود رسول اللہ ﷺ نے تو اپنے دست مبارک سے کسی کو بسم اللہ الرحمن

۹۵۔ ایضاً: ص ۱۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الرحیم بھی لکھ کر نہیں دی تھی، بعینہ اسی طرح صدری حفاظت اور تعامل کے ساتھ ساتھ سنتِ رسول کو بھی مکتوبی صورت میں سب سے پہلے صحابہ کرام نے ہی امت تک پہنچایا ہے، بعد کے محدثین نے صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی کے لحاظ سے مسانید مرتب کیں اور پھر فقہی عنوانات کے تحت ان کو مرتب ومدّون کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے امت کو صرف قرآن ہی نہیں دیا بل کہ اپنے اقوال، افعال اور تقریرات (سنت) کی صورت میں وہ بیان قرآن بھی یقیناً دیا جس کے بغیر قرآن کریم کے مجمل احکام ومضامین پر عمل ممکن ہی نہیں۔ بالفرض یہ بیان قرآن جو وحی کتاب نہیں بل کہ وحی غیر کتاب ہے، نہ بھی لکھا جاتا تو بھی اس کا حجت یعنی معتبر اور واجب التسلیم ہونا قطعاً متاثر نہ ہوتا۔ تورات کے نزول سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر سال ہا سال جو وحی غیر کتاب نازل ہوتی رہی وہ لکھی ہوئی نہ ہونے کے باوجود لوگوں پر حجت تھی اور اسی وحی غیر کتاب کا انکار کر کے فرعون اور اس کے ساتھی عذاب خداوندی کا شکار ہوئے۔ ادھر حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لکھوائے ہوئے خطوط، معاہدات، متعدد احکام، حضرت انسؓ کی وہ احادیث جوانہوں نے آپ پر پیش بھی کی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا صحیفہ، حضرت علیؓ کا صحیفہ وغیرہ وغیرہ احادیث آپ کی رحلت کے موقع پر معدوم نہیں ہوگئی تھیں کہ انتہائی ڈھٹائی سے یہ جھوٹ بولا جائے کہ آپ نے امت کو صرف قرآن ہی دیا تھا اور بیانِ قرآن کی صورت میں کچھ دیا ہی نہیں تھا۔ محمد اسلم جیراج پوری نے یہ بھی لکھا ہے ”خود بخاری شریف میں بھی یہ حدیث موجود ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ نبی کریم ﷺ نے امت کے لیے کیا چھوڑا ہے تو آپ نے کہا ماترك الا مابین الدفتین یعنی حضور نے قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ نہیں چھوڑا“۔ (۹۶) حضرت ابن عباسؓ یہاں کلام اللہ کی بات کر رہے ہیں۔ احادیث وحی پر مبنی ہونے کے باوجود کلام رسول ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کے پیش نظر ان روافض کی تردید تھی جو یہ کہتے تھے کہ خلفائے ثلاثہؓ نے فضائل علی وغیرہ کی بہت سی آیات قرآن سے نکال دی ہیں۔ ان ہی حضرت ابن عباسؓ کے متعلق جیراج پوری صاحب نے یہ لکھا ہے ”حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی کتابت حدیث سے منع فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ گذشتہ قوموں کی ہلاکت اسی وجہ سے ہوئی ہے“۔ (۹۷) اگر جیراج پوری کا مقصد دھوکہ اور فریب دینا نہیں تھا تو اسی کتاب جامع بیان العلم کے اگلے باب میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق وہ یہ روایت

۹۶۔ مقام حدیث: ص ۱۰

۹۷۔ مقام حدیث: ص ۹۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہرگز نہیں چھوڑتے: عن یحیی بن کثیر قال قال ابن عباس ﷺ قیدو العلم بالکتاب ”یحییٰ بن کثیرؒ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ علم حدیث کو لکھ کر محفوظ کر لو“۔ اگر حضرت ابن عباسؓ مطلقاً منع کتابت کے قائل ہوتے تو خود ان کے پاس احادیث کا لکھا ہوا مجموعہ کیوں تھا جس سے ان کے شاگرد بھی احادیث نقل کرتے تھے جیسا کہ کتاب حدیث کے ضمن میں ہم نے حضرت ابن عباسؓ کے صحیفے کا بھی ذکر کیا ہے۔ انہوں نے نااہل لوگوں کو کتابت حدیث سے روکا ہوگا۔ نااہل لوگوں کو تو کتابت قرآن کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یا اگر وہ کسی وقت کتابت حدیث (وحی غیر کتاب) کو ضروری نہیں سمجھتے تھے تو بدلتے حالات کے تحت وہ بعد میں اس کے قائل ہو گئے۔

۱۲۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کے متعلق ”مقام حدیث“ میں لکھا ہے: ”ابو نضرہؒ نے ابو سعید خدریؓ سے پوچھا کہ جو حدیثیں ہم آپ کی زبان سے سنتے ہیں لکھ لیا کریں؟ فرمایا۔ تم ان کو مصحف بنانا چاہتے ہو؟“۔ [۹۸] اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں جو جیراج پوری نے اپنے قارئین کو دھوکے میں رکھنے کے لیے چھوڑ دیے: ولکن خذوا عنا کما اخذنا عن رسول اللہ ﷺ [۹۹] ”لیکن تم ہم سے احادیث اسی طرح حاصل کرو جس طرح ہم نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کی ہیں“۔ بارہا لکھا جا چکا ہے کہ حدیث وحی غیر متلو اور وحی غیر کتاب ہے۔ یہ مکتوبی صورت میں نہ بھی ہو تو بھی اس کا حجت ہونا متاثر نہیں ہوتا، اگر معدودے چند بعض اصحاب وحی غیر کتاب کی کتابت کو نہ پسند کرتے ہوں تو اس سے حدیث کا حجت نہ ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا ورنہ حضرت ابو سعید الخدریؓ احادیث بیان ہی نہ کرتے اور نہ ہی یہ فرماتے کہ ”جس طرح ہم رسول اللہ ﷺ سے احادیث حاصل کیا کرتے تھے اسی طرح تم بھی ہم سے احادیث حاصل کرو“۔ ظاہر ہے کہ جہاں متعدد صحابہ کرامؓ دور نبوی میں احادیث کو لکھا بھی کرتے تھے تو بہت سے ان کی صدری حفاظت کو ہی اس وقت کے لحاظ سے کافی سمجھتے تھے۔

۱۳۔ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کے متعلق ”مقام حدیث“ میں لکھا ہے کہ ان کے پاس ایک نوشتہ لایا گیا جس میں حدیثیں تھی تو انہوں نے اس کو جلا دیا“۔ [۱۰۰] یہاں بھی دجل اور فریب سے کام لیا گیا ہے کیوں کہ جس کتاب ”جامع بیان العلم“ سے یہ روایت لی گئی ہے اسی کتاب کے اگلے باب میں یہ

۹۸۔ ایضاً ۹۲

۹۹۔ جامع العلم: ج ۱، ص ۶۴

۱۰۰۔ مقام حدیث: ص ۹۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روایت بھی موجود ہے کہ معن کہتے ہیں کہ عبدالرحمن بن عبداللہ بن مسعود نے میرے سامنے ایک کتاب نکالی اور قسم اٹھاکر کہا اسے میرے باپ عبداللہؓ بن مسعود نے لکھا ہے"۔ (۱۰۱) اس روایت کو چھوڑ دینا اور صرف منع کتابت کی روایت کو پیش کرنا قارئین کو دھوکہ دینے کے لیے ہے۔ اگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کسی مجموعۂ احادیث کو جلا دیا تھا تو وہ جلائے جانے کے ہی لائق ہوگا نہ یہ کہ حضرت عبداللہ بن مسعود احادیث کو حجت نہیں سمجھتے تھے اور اس کی کتابت کے مطلقاً قائل نہ تھے۔

۱۴۔ احادیث کی حیثیت وحی غیر کتاب کی ہے۔ بعض روایات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ میں سے معدودے چند حضرات مثلاً حضرت زید بن ثابتؓ، ابوسعید خدریؓ کتابت حدیث کی بہ جائے صرف اس کی صدری حفاظت کے قائل تھے، بعض حضرات احادیث لکھنے کو تو جائز سمجھتے تھے لیکن جب احادیث یاد ہو جائیں تو ان کی تحریر کو مٹا دینے کو بہتر سمجھتے تھے۔ لیکن صحابہ کرامؓ کی اکثریت احادیث کی کتابت کو نہ صرف جائز بل کہ مستحب خیال کرتی تھی۔ متقدمین حضرات کے ہاں یہ عام رواج تھا کہ وہ کسی بھی عنوان پر موسوعی (انسائیکلوپیڈک) انداز میں روایات اور متعلقہ مواد کو جمع کر دیتے تھے۔ اس میں وہ صحیح حسن، ضعیف بل کہ موضوع روایات تک بھی عموماً مع اسناد یک جا کر دیتے تھے، اور صحیح و غلط میں تمیز کرنے اور موافق و مخالف روایات کا مقابلہ وموازنہ کرنے کے بعد ان میں فیصلہ صادر کرنے (محاکمے) کی ذمہ داری اہل علم قارئین پر چھوڑتے تھے اور بسا اوقات خود بھی اپنی رائے کا اظہار کر دیتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبرؒ کی کتاب جامع بیان العلم بھی اسی نوعیت کی ہے۔ اس کے ۱۸۳ ابواب ہیں، جن میں انہوں نے موافق و مخالف روایات کو یک جا کر دیا ہے۔ ان میں بہت سی روایات کا غیر مستند ہونا وہ خود بھی واضح کر دیتے ہیں اور روایات پر اپنا تبصرہ پیش کر کے صحیح نتائج تک پہنچنے میں قارئین کی مدد کرتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک کتاب امام ابن قتیبہؒ کی "مختلف الحدیث" ہے جس میں بہ ظاہر معارض و مخالف دکھائی دینے والی روایات میں انہوں نے نہایت معقول انداز میں تطبیق پیدا کی ہے۔ جہاں تک محض ظاہری اور صوری تعارض کی بات ہے اس کی متعدد مثالیں تو قرآن کریم میں بھی مل جائیں گی۔ مثلاً سورہ قصص میں ہے: اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ‌ ۚ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ (۱۰۲) "بے شک (اے پیغمبر!) تو جسے چاہے ہدایت نہیں دے سکتا بل کہ اللہ ہی جسے چاہتا

۱۰۱۔ جامع بیان العلم: ج ۱، ص ۳۷، باب جواز کتابۃ العلم

۱۰۲۔ القصص: ۵۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے "لیکن اس کے عین برعکس سورہ شوریٰ میں ہے: وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ [103] "اور بے شک (اے پیغمبر!) تو سیدھے راستے کی (لوگوں کو) ہدایت دیتا ہے"۔ ان دونوں آیات کے مفہوم میں تطبیق یوں پیدا کی جاتی ہے کہ ہدایت کا معنیٰ ایصال الی المطلوب (منزل مقصود یعنی جہنم سے بچا کر جنت میں پہنچا دینے) کا ہو تو اس معنیٰ میں ہادی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ پیغمبروں کے اختیار میں ایسا ہوتا تو مثلاً حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ آذر کو اور رسول اللہ ﷺ اپنے چچا ابولہب کو ضرور ہدایت پر لے آتے۔ اگر ہدایت کا معنیٰ اراۃ الطریق (راستہ دکھانے) کا ہو تو اسی معنیٰ میں حضرات انبیا علیہم السلام اور ان کے سچے ورثا علمائے کرام لوگوں کو صراط مستقیم دکھاتے ہیں۔

الغرض متقدمین اہل علم اپنی تصنیفات و تالیفات میں موافق و مخالف آرا و نظریات ہر دو کے حق میں رطب و یابس ہر طرح کی روایات جمع کر دیتے تھے۔ علمی تحقیق اگر مقصود ہو اور قارئین کو صحیح نتائج تک پہنچانے کا جذبہ صادقہ ہو تو دیانت و امانت کا تقاضا یہ ہے کہ قارئین کے سامنے ہر طرح کا مواد رکھا جائے اور صحیح و غلط میں امتیاز کی ان کے لیے سہولت پیدا کی جائے۔ متعصب مستشرقین اور اہل باطل ملحدین کی بدترین علمی خیانت یہ ہے کہ وہ اس طرح کی کتب سے من پسند مواد پیش کر کے لوگوں کو گم راہ کرتے ہیں اور انہیں خوب دھوکہ دیتے ہیں۔ عبارتوں میں قطع و برید اور تصویر کا صرف ایک رخ پیش کرتے ہوئے تلبیس ابلیس سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً حافظ ابن عبدالبر کی کتاب جامع بیان العلم کے چار ابواب منکرین حدیث کو نہایت ہی مرغوب ہیں تاکہ تصویر کا صرف ایک ہی رخ لوگوں کے سامنے آئے۔ (۱) کراھیۃ کتابۃ العلم و تخلیدہ فی الصحف یعنی علم کو لکھنے اور ہمیشہ تحریری حالت میں اسے رکھنے کی ناپسندیدگی"۔ اس باب میں بتایا گیا ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ حدیث زبانی یاد کر لینے کے بعد تحریر کو مٹا دیتے تھے۔ (۲) اختلاف العلماء فی بعض الفروع اس باب میں اہل علم کے مابین بعض فروعی اختلافات کا جو ذکر ہے اسے منکرین حدیث خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو احادیث سے بدگمان کیا جائے۔ (۳) من ذم الاکثار فی الحدیث دون التفھم لہ و التفقہ فیہ یعنی ان لوگوں کا بیان جنہوں نے ان زیادہ حدیثیں بیان کرنے والے لوگوں کی مذمت کی ہے جو سمجھے اور

۱۰۳۔ الشوریٰ: ۵۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غور و فکر کئے بغیر ایسا کرتے ہیں"۔ اس باب کے عنوان کا حوالہ دیے بغیر اس میں سے منکرین حدیث اپنے مذموم مقاصد کے لیے روایات پیش کرتے ہیں۔(۴) لا یقبل قول بعض العلماء فی بعض الاّ ببینۃ یعنی ایک عالم کا دوسرے عالم کے خلاف کوئی قول ثبوت کے بغیر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کی جرح کو محدثین کی اصطلاح میں جرح مُبہم یا جرح غیر مُفسر کہا جاتا ہے۔ اور اگر کسی کے خلاف کوئی قول اطمینان بخش دلیل اور ثبوت کے ساتھ پیش کیا جائے تو اسے جرح مُفسر کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف جرح مفسر ہی قابل قبول ہو سکتی ہے۔ اس باب سے منکرین حدیث روایات اس مذموم مقصد سے پیش کرتے ہیں کہ متعلقہ اہل علم کو غیر معتبر ٹھہرایا جا سکے۔ حال آں کہ اسی کتاب میں احادیث کی کتابت کے جواز اور احادیث کی کتابت کے استحباب پر بھی ابواب موجود ہیں لیکن منکرین حدیث ان میں دی گئی روایات کو اپنے مذموم مقاصد کی خاطر قطعاً نظر انداز کرتے ہیں اور قارئین کو ان سے بے خبر رکھتے ہیں۔ منع کتابت کی صحاح ستہ میں انہیں صرف ایک روایت ملی اسے تو خوب اچھالتے ہیں اور اس پر اپنی طرف سے خوب حاشیہ آرائی کرتے ہیں، حال آں کہ صحاح ستہ میں بہت سی ایسی احادیث بھی تو موجود ہیں جن سے کتابت حدیث کی اجازت و ترغیب اور بعض صورتوں میں کتابت کا حکم بھی پایا جاتا ہے۔ ایسی تمام روایات سے وہ یوں منہ موڑتے ہیں گویا انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ حال آں کہ یہ احادیث تعداد میں کہیں زیادہ اور بہ اعتبار سند بھی قوی تر ہیں۔ منکرین حدیث کی اس طرح کی علمی خیانت اور فریب دہی کی جو مثالیں اوپر پیش کی جا چکی ہیں ان سے صورت حال کو سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔

اسی طرح طاہر بن صالح الجزائری کی کتاب "توجیہ النظر" کی چند صفحات پر مشتمل صرف تیسری فصل ہی منکرین حدیث کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے نہایت مرغوب ہے جس کا عنوان ہے الفصل الثالث فی تثبت السلف فی امر الحدیث خشیۃ ان یدخل فیہ مالیس منہ "حدیث کے بارے میں سلف کی احتیاط اور تحقیق اس خدشے کی بنا پر کہ کہیں حدیث میں وہ مواد داخل نہ کر دیا جائے جو حقیقۃً اس میں شامل نہیں"۔ امام ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ سے بھی اپنا من پسند مواد لیا جاتا ہے حال آں کہ ان کتب کے مصنفین و مؤلفین حجیت حدیث کے بھرپور قائل ہیں۔ وہ بعض عنوانات پر موافق و مخالف روایات صرف اس لیے پیش کرتے ہیں کہ ان کا موازنہ کر کے جن صحیح نتائج پر ان کتاب کے مؤلفین خود پہنچے ہیں، قارئین بھی ان نتائج کے صحیح ہونے کو بہ خوبی سمجھ سکیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۵۔ احادیث میں روایت بالمعنیٰ کے متعلق "مقام حدیث" میں لکھا ہے کہ احادیث تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں۔ چناں چہ متعلقہ عبارت یہ ہے "احادیث کی جس قدر کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں (بخاری و مسلم سمیت) ان کے الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں ہیں۔ یہ احادیث اور روایات بالمعنیٰ ہیں... اب ذرا تصور میں لایئے کہ یہ سلسلہ ایک دو دن نہیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال نہیں بل کہ اڑھائی سو سال تک یونہی جاری رہے... اور کروڑوں نہیں تو کم از کم لاکھوں آدمیوں کے ذریعے یہ باتیں منتقل ہوتی رہیں تو ان میں جو اصلیت باقی رہ جائے گی وہ ظاہر ہے۔

یہاں ایک دھوکہ تو یہ دیا گیا ہے کہ اڑھائی سو سال تک احادیث کی روایت صرف زبانی طور پر ہوتی رہی، شاید اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر اس سے بڑا جھوٹ کبھی نہ بولا گیا ہو۔ اوپر متعلقہ عنوانات کے تحت اچھی طرح واضح کیا جا چکا ہے کہ احادیث کی صدری حفاظت کے ساتھ ساتھ ان کی کتابت کا سلسلہ دور نبوی، خلفائے راشدینؓ اور دور تابعین و تبع تابعینؒ میں تسلسل سے جاری و ساری رہا۔ تیسری صدی ہجری میں احادیث کی جمع و تدوین کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سے پہلے احادیث مکتوبی صورت میں کہیں موجود ہی نہیں تھیں۔ تیسری صدی ہجری کے محدثین نے اپنے اسلاف کی روایات کو صحابہ کرامؓ کے ناموں سے مسانید کی صورت میں، فقہی عنوانات اور ابواب کی ترتیب سے سُنن کی صورت میں اور تمام عنوانات پر روایات کو جمع اور یک جا کرنے کے التزام و اہتمام سے "جامع" کی صورت میں امت کے لیے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ دوسرا جھوٹ یہ بولا گیا ہے کہ ان احادیث میں ہمیشہ روایت بالمعنیٰ ہی ہوئی ہے حال آں کہ ہم اوپر متعلقہ عنوانات کے تحت یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ ادعیہ و اذکار، نماز کے تشہد، دعائے استخارہ وغیرہ کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو اسی طرح دیتے تھے جیسے قرآن کریم کی سورتیں سکھاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھوائے ہوئے خطوط، احکام و فرامین، معاہدات وغیرہ میں روایت باللفظ کے اہتمام والتزام کی مثالیں بھی سابقہ مباحث میں پیش کی جا چکی ہیں۔ قولی روایات کے متعلق بھی بتایا جا چکا ہے، مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اور ان کے کئی ساتھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھ کر احادیث قلم بند کیا کرتے تھے۔ اور مثلاً دس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرنے والے خادم رسول حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بھی احادیث لکھ رکھی تھیں اور انہوں نے آپ پر یہ احادیث پیش بھی کی تھیں۔ تو یہ دعویٰ کرنا کہ احادیث کا سارے کا سارا ذخیرہ صرف روایت بالمعنیٰ پر ہی مبنی ہے، سراسر غلط قرار پاتا ہے۔ جہاں تک روایت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالمعنیٰ کا تعلق ہے تو اوپر متعلقہ عنوان کے تحت بتایا جا چکا ہے کہ متعلقہ شرائط کو ملحوظ رکھا جائے تو عقلاً ونقلاً اس کی بھی پوری پوری گنجائش موجود ہے۔ اور جب منکرین حدیث کو یہ بھی تسلیم ہے کہ صرف نو دس حضرات نے ہی نہیں بل کہ کروڑوں نہیں تو بھی کم از کم لاکھوں افراد کے ذریعے یہ روایات (گو ان کے جھوٹے دعوے کے مطابق زبانی ہی سہی) لوگوں تک منتقل ہوتی چلی آ رہی تھیں تو الفاظ وکلمات کے اختلاف کے باوجود اگر معنیٰ ومفہوم میں فرق نہ آئے تو اس سے، لفظی تواتر نہ سہی لیکن معنوی تواتر تو پھر بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ نیز روایت باللفظ تو صرف قولی احادیث میں ہی ممکن ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے افعال وتقریرات (فعلی وسکوتی احادیث) پر مشتمل روایت تو لازماً روایت بالمعنیٰ کے ساتھ ساتھ تعامل امت سے ہی آگے منتقل ہو سکتی ہے۔ اگر منکرین حدیث ان ہی روایات کو ہی قبول کریں تو بڑی حد تک اختلاف رفع ہو جائے گا۔ فھل انتم مومنون؟

۱۶۔ منکرینِ حدیث کا ایک فریب یہ بھی ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک مستشرقین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اختلاف قراءت کی روایتوں کو اچھالتے ہیں تاکہ یہ تاثر قائم ہو سکے کہ احادیث کو معتبر قرار دینے سے قرآن کریم کی صحیح جمع وتدوین کے متعلق شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں ایک دھوکہ تو یہ دیا جاتا ہے کہ وہ متقدمین کے اس منہج سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں کہ وہ کسی بھی عنوان پر موافق و مخالف روایات کو موسوعی (انسائیکلوپیڈک) انداز میں جمع کر دیتے تھے اور اس کوشش میں رطب ویابس ہر طرح کا مواد وہ جمع کر دیتے تھے۔ قراتوں کے اختلاف کی معدودے چند روایات جو سنداً صحیح بھی ہیں، لیکن تواتر سے منتقل ہونے والے قرآنی متن سے کچھ مختلف ہیں، انہیں بالاتفاق شاذ قرائتیں کہا جاتا ہے، جو متواتر قراتوں کے مقابلے میں متروک اور ناقابل قبول ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ اختلاف پیدا ہی کیوں ہوا تھا تو اس کا جواب خود منکر حدیث غلام احمد پرویز نے یہ دیا ہے: ”قراءت کے اختلاف کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ عربوں کے مختلف قبیلے بعض حروف کو مختلف طریق سے ادا کیا کرتے تھے۔ مثلاً بعض قبیلے ک کو گ بولتے تھے، اسی طرح جس طرح آج کل لاہور کے اصل باشندے ”ڑ کو ”ر“ کہتے ہیں (یعنی چڑی کو چری)، اور ہوشیار پور کے رہنے والے واہیات کو باہیات کہتے ہیں حتیٰ کہ حیدر آبادی قرآن کو خرآن بولتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ اس اختلاف کے متعلق ابن خلدون نے لکھا ہے: ''قرأت کے اختلاف قرآن کے تواتر میں مطلق خلل انداز نہیں ہو سکے کیوں کہ ان کا مرجع کیفیت ادائے حروف تھا''۔ (۱۰۴)

مذکورہ عبارت میں مختلف قبائل کے لب و لہجے میں باہم اختلاف کا ذکر ہے۔ لب و لہجے کا یہ اختلاف بل کہ الفاظ کا اختلاف ایک ہی قبیلے اور ایک ہی مقام بل کہ ایک ہی خاندان کے افراد میں بھی نہ صرف عقلاً ممکن ہے بل کہ خارجی شواہد سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔ ایک ہی خاندان کے کچھ گھرانوں میں مثلاً باپ کو اباجی، ابوجی اور چچا کو چچا جان، چاچو وغیرہ مختلف انداز سے بولا جاتا ہے۔ پنجابی بولنے والے ایک ہی خاندان میں مثلاً لحاف کو لحاف اور لیف (یائے مجہولہ کے ساتھ)، سیڑھی کو سیڑھی اور پوڑی، چھپکلی کو چھپکلی اور کرلی کہتے ہیں۔ کب کو کدو اور کدوں، ہنڈیا کو ہانڈی اور توڑی بولتے ہیں۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ نزول قرآن کے ابتدائی دور میں لوگوں کی سہولت کے لیے احادیث صحیحہ کی رو سے خود رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے قرآن کی سات حروف (لہجوں) میں پڑھنے اور پڑھانے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ مختلف قبائل کے لوگوں کی مزید سہولت کے لیے قرآنی آیات کے بعض کلمات میں مترادفات (ہم معنی الفاظ) کی بھی اجازت تھی۔ رسول اللہ ﷺ ہر سال رمضان کے مہینے میں حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ قرآن کا معارضہ (آج کل کی اصطلاح کے مطابق دَور) فرمایا کرتے تھے۔ آخری رمضان میں یہ دَور آپ نے دو مرتبہ فرمایا۔ ہر سال کے اس دَور میں کئی قرأتیں منسوخ ہوتی چلی گئیں۔ آخری معارضے یعنی آخری دَور کی قرأت ہی معتبر ترین تھی، لیکن بہت سے حضرات میں قرأت کے کچھ اختلاف چلے آرہے تھے۔ عجمیوں نے جب بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا تو یہ اختلاف ان میں باہم جھگڑوں کا سبب بننے لگے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے اس اختلاف کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے قرآن کریم کی اس نسخے کے پیش نظر از سر نو کتابت کرائی جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں مرتب کروایا گیا تھا اور اس کی نقول تمام صوبوں میں بھجوائیں۔ ساتھ ہی دیگر نسخوں کو ضائع کرنے کا لوگوں کو عام حکم جاری فرمایا۔ دور جاہلیت اور دور نبوت میں عربوں میں لکھنے پڑھنے کا عام رواج نہیں تھا۔ قرآن کریم اور اسی طرح احادیث کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ انہیں زبانی یاد کرنا تھا۔ عربوں کا حافظہ ضرب المثل ہے۔ اسی صدری حفاظت کا انہوں نے پورا پورا حق ادا کیا۔ قرآن کریم جن کاتبین وحی نے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے اور دیگر صحابہ کرامؓ نے اپنے طور پر منتشر اجزا پر لکھ رکھا تھا، تو طرز تحریر میں اختلاف اور کاتبین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرات کی طرف سے املا کی بعض اغلاط کا سرزد ہونا ایک فطری عمل تھا۔ اسی اختلاف کو ختم کرنے کے لیے حضرت عثمانؓ اور صحابہ کرامؓ نے قرآن کریم کو صرف لغتِ قریش پر لکھوایا۔ قرآن کریم کی مشہور سات قرآتوں کا تعلق (جو ذیلی شاخوں کے اعتبار سے دس بل کہ اس سے بھی کچھ زائد پر مشتمل ہیں) بعض الفاظ یا حروف کی ادائیگی مثلاً مَد، لین، تخفیف، اظہار، امالہ اور ادغام وغیرہ سے ہے۔ یہ اختلاف باجماعِ امت کسی خلفشار یا انتشار کا باعث نہیں ہے۔ اگر بالفرض بعض روایات کے مطابق حضرت عثمانؓ کے تیار کرائے ہوئے ان مصاحف میں اصل مصحف سے کہیں چند ایک مقامات پر کاتبوں کی غلطی سے کوئی فرق رہ بھی گیا ہو تو بعد میں اس کی اصلاح ہوگئی۔ ان دنوں عربی عبارات پر اعراب اور نقطوں کا بھی رواج نہیں تھا۔ املا اور کتابت میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہتری پیدا ہوتی چلی گئی۔ اس سے حفاظت قرآن قطعاً متاثر نہیں ہوتی۔ کیوں کہ شروع ہی سے حفاظت کا انحصار کتابت سے زیادہ زبانی یاد کرنے پر تھا۔

اہل علم کا یہ اجماعی فیصلہ ہے کہ وہ احادیث جن کی حیثیت اخبار آحاد کی ہے اگر وہ قرآن کریم کے مُعارض نظر آئیں تو انہیں کتاب اللہ کے تابع کرتے ہوئے کتاب اللہ سے ان کی مطابقت پیدا کی جائے گی، کیوں کہ محض ظاہری اور صوری اختلاف تو خود قرآن کریم کے معانی میں بھی بعض اوقات نظر آتا ہے۔ یہ حقیقی تعارض نہیں ہے۔ اگر ان اخبار آحاد کی کتاب اللہ سے تطبیق یا صحیح توجیہہ کسی بھی صورت میں بہ ظاہر ممکن نہ ہو تو ان روایات کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف کتاب اللہ کو لیا جائے گا۔

جہاں تک موضوع اور مردود روایات کا تعلق ہے وہ تو سرے سے خارج از بحث ہیں۔ قرآن کریم کی جمع و تدوین کے سلسلے میں مستشرقین کے اعتراضات کے متعلق ہم نے عیسائیت پر اپنے مضامین میں مفصل مباحث پیش کئے ہیں اور قرآن کریم کی جمع و تدوین کا ہم نے بائیبل کی جمع و تدوین سے بجا طور پر تقابل بھی کیا ہے اور مستشرقین کے جھوٹ اور فریب کو نمایاں کیا ہے۔ (۱۰۵) الغرض احادیث صحیحہ کے بغیر تو قرآن کریم کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہر گز ممکن نہیں چہ جائیکہ یہ جھوٹا تاثر قائم کیا جائے کہ احادیث نے قرآن کریم کے محفوظ کتاب ہونے کو بھی (معاذ اللہ) مشکوک ٹھہرا دیا ہے۔ البتہ منکرین حدیث انکار حدیث کے ساتھ ہر گز قرآن کریم کو محفوظ کتاب ثابت نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ اس کے محفوظ ہونے کی داخلی شہادتوں سے غیر مسلم تو متاثر نہیں ہو سکتے جب تک کہ خارجی شواہد پر مشتمل روایات کو معتبر اور مستند ثابت نہ کیا جائے۔ حدیث جب منکرین حدیث کے نزدیک معتبر و مستند ہی نہیں تو وہ مخالفین کے

© rasailojaraid.com

۱۰۵۔ مجلہ السیرۃ شمارہ ۲۱، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز ۱۷۔ ن ج ۴، ص ۱۷

© rasailojaraid.com

ساتھ اپنے مباحث میں احادیث سے استدلال کے سرے سے مجاز ہی نہیں ہیں۔ جہاں تک طبقاتی و عملی تواتر سے قرآن کے محفوظ و معتبر ہونے کا تعلق ہے تو اسے تبھی تو تسلیم کیا جاسکتا ہے جب کہ اس کی تلاوت کو بھی مقصود بالذات قرار دیا جائے اور اس کو زبانی یاد کرنے کی فضیلت کا بھرپور اعتراف کیا جائے۔ قرآن کریم کو صحیح طریقے سے سمجھنے اور سمجھانے والے ہر دور میں بلاشبہ موجود رہے ہیں اور ان شاء اللہ العزیز تاقیامت موجود رہیں گے، لیکن اگر تلاوت و حفظ کے ساتھ قرآن کریم کو ہر حال میں سمجھ کر پڑھنے کی قید بھی لگادی جائے تو ہر دور میں قرآن کریم کے جتنے حفاظ اور قاری حضرات اب تک ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے، وہ ہرگز لاکھوں کی تعداد میں نہ ہوتے، بل کہ انتہائی محدود تعداد میں ہوتے اور قرآن کریم کی صدری حفاظت کا دعویٰ بھی مشکوک و متشبہ ہو کر رہ جاتا۔ ادھر منکر حدیث مسٹر غلام احمد پرویز نے لکھا ہے "قرآن ایک کتاب ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔ کہیے کیا اس کے الفاظ دہرا لینے سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا؟ نیز قرآن اپنے مضامین پر بار بار غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ کیا قرآن کا یہ مقصود بلا سوچے سمجھے پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے؟"[۱۰۶] اس کا مطلب یہ ہوا کہ منکرین حدیث روایات و احادیث سے تو قرآن کریم کی صحیح جمع و تدوین اور محفوظیت قرآن کو ہرگز ثابت نہیں کر سکتے اور نہ ہی وہ ایسا کرنے کے مجاز ہو سکتے ہیں، رہا عملی تواتر تو چوں کہ عربی زبان جانے بغیر قرآن کی تلاوت ان کے نزدیک (معاذ اللہ) محض بے سود ہے، اور حفاظ کا بہت بڑا طبقہ اسی طرح تلاوت کرتا رہا ہے، لہٰذا یہ طریقہ بھی منکرین حدیث کے نزدیک معتبر نہ رہا۔ جہاں تک احادیث کے بغیر قرآن سمجھنے کی بات ہے تو آج تک منکرین حدیث کا کوئی گروہ یا فرد صرف اقامتِ صلوٰۃ کا ہی صحیح مطلب اور طریقہ نہ بتا سکا ہے نہ قیامت تک بتا سکتا ہے۔ قرآن کریم کے حروفِ مقطعات اور جن آیات کو متشابہات کہا گیا ہے۔ ان کا مطلب تلاش کرنے کے درپے ہونے کو تو قرآن کریم میں گم راہی قرار دیا گیا ہے اور چوں کہ منکرین حدیث کے نزدیک سمجھے بغیر قرآن کی تلاوت بے کار ہے لہٰذا منکرین حدیث کے خیال میں حروفِ مقطعات اور متشابہ آیات کو یا تو (معاذ اللہ) قرآن سے نکال دینا چاہیے یا تلاوت کرتے ہوئے سخت احتیاط کرنی چاہیے کہ کہیں ایسی آیات کی بھی "غلطی سے" تلاوت نہ ہو جائے۔ یہاں اصل حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا اپنی جگہ پر مقصود بالذات ہے اور اس کی تلاوت اور اسے حفظ کرنا اپنی جگہ پر الگ مقصود بالذات ہے۔ اور قرآن کریم کی

© rasailojaraid.com

۱۰۶۔ قرآنی فیصلے: ص ۱۰۳

© rasailojaraid.com

جمع و تدوین اور حفاظت پر مشتمل روایات کو معتبر و مستند سمجھے بغیر قرآن کو محفوظ کتاب ثابت کرنا منکرین حدیث کے لیے ہرگز ہرگز ممکن نہیں ہے۔

۱۷۔ سچے دین اسلام کا یہ اعجاز ہے کہ دشمنانِ اسلام اس میں الحاد و تحریف کی جو بھی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی اس سعی نامشکور کی ناکامی کے غیبی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ کتابت حدیث کا تسلسل دور نبوی سے جاری و ساری ہے لیکن منکرین حدیث ذخیرۂ احادیث میں منعِ کتابت کی صرف ایک روایت پر خوب حاشیہ آرائی کرتے ہوئے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حدیث دین میں حجت یعنی معتبر و مستند اور واجب التسلیم نہیں ہے۔ لیکن منع کتابتِ حدیث کی یہ روایت بھی تو منکرین حدیث کے موقف کی مکمل بیخ کنی کر رہی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: وما ینطق عن الهوی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحیٌ یُوْحیٰ [۱۰۷]۔ "اور یہ (پیغمبر) خواہشِ نفس سے بولتا ہی نہیں، یہ تو وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے"۔

اب یہاں نطق رسول (رسول کے بولنے اور کلام کرنے) میں عقلاً دو شقیں ہی ممکن ہیں۔ یا تو اس نطقِ رسول سے صرف قرآن کریم کا پڑھ کر سنانا مراد ہے یا دین کے متعلق آپ کے تمام نطق یعنی قرآنی اور غیر قرآنی دونوں اقوال اس میں داخل ہیں۔ اگر دوسری شق اختیار کی جائے تو دین کے متعلق آپ کے تمام اقوال وحی میں داخل ہوئے، لہٰذا حدیث کی کتابت سے کسی خاص موقع پر آپ ﷺ نے منع فرمایا ہو تو یہ لازماً غیر قرآنی وحی کی بنا پر ہوا کیوں کہ قرآن کریم میں تو ایسا کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ بل کہ قرآن کریم میں تو خود قرآن کریم کی کتابت یا عدم کتابت کا بھی کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ غیر قرآنی وحی خواہ مکتوبی ہو یا غیر مکتوبی، بہ ہر حال حجت اور واجب التسلیم ہے۔ دیکھیے کوہ طور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جو کلام فرمایا تھا اسے اللہ تعالیٰ نے وحی قرار دیا ہے۔ چناں چہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا تھا: فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحیٰ۔ [۱۰۸] "اے موسیٰ! جو (تیری طرف) وحی کیا جاتا ہے اسے خوب غور سے سُن"۔ یہ یقیناً غیر توراتی وحی تھی، کیوں کہ تورات کا تو اس وقت دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ یہ تو فرعون اور اس کے ساتھیوں کے غرق ہونے کے بعد کہیں جاکر آپ پر نازل ہوئی تھی۔ جب آپ فرعون کے پاس گئے تھے، تو اس غیر توراتی وحی کو کسی کتاب یا صحیفے کی صورت میں اس کے پاس لے کر نہیں گئے تھے۔ یہ

© rasailojaraid.com

۱۰۷۔ النجم: ۳۔۴

© rasailojaraid.com

غیر توراتی اور غیر مکتوبی وحی حجت اور واجب التسلیم نہ ہوتی تو فرعون اور آل فرعون کو غرق نہ کیا جاتا۔ پس غیر قرآنی وحی (حدیث) مکتوبی ہو یا غیر مکتوبی، اس کا حجت اور واجب التسلیم ہونا کسی بھی صورت میں متاثر نہیں ہوتا۔ اگر پہلی شق اختیار کی جائے کہ نطق رسول میں صرف قرآنی وحی داخل ہے، اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ پر قرآن کے علاوہ اور کوئی وحی نازل ہی نہیں ہوئی تو قرآن کریم پر زائد آپ ﷺ کے تمام اقوال (معاذ اللہ) لازماً آپ کی ہویٰ (خواہش نفس) پر مبنی ہوں گے، لہٰذا منعِ کتابت حدیث کا آپ کا قول بھی (معاذ اللہ) آپ کی خواہش نفس پر مبنی ہوگا۔ خواہش نفس پر مبنی قول دین کا حصہ نہیں ہو سکتا پس اس سے کوئی دینی مسئلہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس سے حدیث کے حجت نہ ہونے کا منکرین حدیث کا دعویٰ بھی ہرگز ثابت نہ ہوا۔ نیز جب منکرین حدیث کے ناپاک افکار و نظریات کے تحت خود رسول اللہ ﷺ کے قرآن پر زائد سب کے سب اقوال (معاذ اللہ) وحی پر مبنی نہیں تو لازماً ہویٰ (خواہش نفس) پر مبنی ہونے کی وجہ سے دین میں داخل نہ ہوئے۔ تو بعد کے مفروضہ مراکز ملت کے اقوال بھی ہرگز دین نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا منکرین حدیث کے "مرکز ملت" کے متعلق سارے تصورات بھی کالعدم اور محض فریب نفس ہوئے۔ خوب غور کیجیے کہ اس منعِ کتابت والی روایت سے بھی منکرین حدیث کے ہاتھ کیا آیا؟ فاعتبروا یااُولی الابصار!!!

الف: خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کی امتیازی شان

منکرینِ حدیث یہ فریب بھی دیتے ہیں کہ خلفائے راشدینؓ رسول اللہ ﷺ کی متعیّن فرمودہ جزئیات میں اپنی طرف سے کمی بیشی قطع و برید اور ترمیم و تنسیخ وغیرہ کے بہ طور "مرکز ملت" مجاز تھے اور بہ قول ان کے حضرت عمرؓ کے بہت سے اقدامات اسی نوعیت کے تھے۔ یہاں تمہیداً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اہل حق کے نزدیک سنت کے مفہوم میں صرف سنت رسول ہی نہیں بل کہ سنت خلفائے راشدینؓ اور بہ حیثیت مجموعی سنتِ صحابہؓ بھی شامل ہے۔ کوئی بھی صحابی بشمول خلفائے راشدینؓ اپنی طرف سے دین میں مسائل گھڑنے والا بہ الفاظ دیگر بدعتی نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ ہر بدعت شرعیہ گمراہی ہے اور صحابہ کرامؓ بہ موجب قرآن مُنعَم علیہم (انعام یافتہ لوگ) ہیں: اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا[109] کے اولین مخاطب وہی ہیں۔ آیت کا ترجمہ اور مفہوم یہ ہے کہ میں نے آج تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور

© rasailojaraid.com

۱۰۹۔ المائدہ: ۳

© rasailojaraid.com

اسلام کو تمھارے لیے بہ طور دین پسند کرلیا۔ اور سورۃ فاتحہ سے ثابت ہے کہ منعم علیہم لوگوں کا راستہ ہی وہ صراط مستقیم ہے جو مطلوب و مقصود ہے، اور یہ ہی وہ صراط مستقیم ہے جسے ان لوگوں کے راستے سے متضاد بیان کیا گیا ہے جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور جو ضالین (گم راہ لوگوں) کا راستہ ہے۔ پس جب صحابہ کرامؓ گم راہ نہیں تو کوئی بھی صحابی بدعتی بھی نہیں ہو سکتا۔

صلح نامہ حدیبیہ کے موقع پر جو صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کے ہم راہ تھے، سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رضامندی کی اور ساتھ ہی مستقبل قریب وبعید میں بے شمار فتوحات و غنائم کی بشارتیں دیں، نیز ان کے متعلق ارشاد فرمایا کہ وہ تمہیں صراط مستقیم پر چلانا چاہتا ہے وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا[110] بعینہ یہ ہی بات سورۂ فتح کی ابتدائی آیات میں خود رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی کہی گئی ہے وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا[111] ”اور تاکہ وہ تجھے سیدھے راستے پر چلائے“۔ پس جس طرح رسول اللہ ﷺ صراط مستقیم پر قائم و دائم ہیں اسی طرح (اختلاف مراتب مدارج کے باوجود) یہ اصحاب رسول بھی صراط مستقیم پر قائم و دائم رہے۔ اسی سورت میں ان کے متعلق یہ بھی فرمایا گیا ہے وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا۔[112] ”اور اس (اللہ) نے انہیں تقویٰ کے کلمے پر قائم رکھا اور وہ اس کے سب سے زیادہ مستحق اور سب سے زیادہ اہل ہیں اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے“۔ سورۂ توبہ میں ہے: الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ اللَّهِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ[113] ”اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا، اللہ کے نزدیک ان کا درجہ سب سے بڑا ہے اور وہی کام یاب لوگ ہیں۔ ان کا رب انہیں اپنی طرف سے بڑی رحمت، عظیم رضامندی اور ایسے باغات کی بشارت دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی نعمت ہے جن میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں بے شک اللہ ہی ہے جس کے پاس (ان لوگوں کے لیے) بہت بڑا اجر ہے“۔ اسی سورہ توبہ میں ہے: وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ

۱۱۰۔ الفتح:۱۸۔۲۱

۱۱۱۔ الفتح:۲

۱۱۲۔ الفتح:۲۶

۱۱۳۔ التوبۃ:۲۰۔۲۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ [۱۱۴] "اور جو مہاجرین وانصار (قبول اسلام میں) سابق اور مقدم ہیں اور جنھوں نے بھی اخلاص کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ بہت بڑی کام یابی ہے"۔ سورۂ لقمان میں ہے: وَّاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ [۱۱۵] "اور تو ہر اس شخص کے راستے کی پیروی کر جو میری طرف رجوع کرتا ہو"۔ غور کیجیے کہ سورۂ توبہ اور سورۃ لقمان کی ان آیات میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر نہیں ہے تاکہ سب پر یہ خوب واضح ہو جائے کہ صحابہ کرام کی عموماً اور ان میں سے سابقون اولون کی خصوصاً پیروی دراصل رسول اللہ ﷺ ہی کی پیروی ہے۔ سب کے سب اصحاب رسول فرداً فرداً معصوم عن الخطاء نہ ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے تھے، لہٰذا من حیث المجموع وہ لائق اتباع ہیں۔ ان کی اتباع رسول کی اتباع ہے۔ چناں چہ سورۂ نساء میں ہے: وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا [۱۱۶] "اور جو شخص بھی رسول کی مخالفت کرے بعد اس کے کہ اس پر ہدایت کھل چکی (وہ خود غور نہ کرے تو اس کا اپنا قصور ہے) اور مومنین کے راستے کے علاوہ کسی اور راستے کی پیروی کرے تو ہم اس کا رخ ادھر ہی کر دیں گے جس طرف اس نے خود کر لیا ہے اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے"۔

غور کیجیے یہاں بہ ظاہر یہی کہنا کافی تھا کہ جو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرے وہ جہنم رسید ہو گا۔ درمیان میں "ویتبع غیر سبیل المؤمنین" کے کلمات لانے کی بہ ظاہر ضرورت نہیں تھی لیکن ایسا اس لیے کیا گیا کہ اگر کوئی شخص اصحاب رسول کے راستے کو چھوڑ کر اتباع رسول کا دعویٰ کرے تو وہ جھوٹا ہے۔ اگرچہ صحابہ کرامؓ کے بعد بھی کسی دینی امر پر امت مسلمہ کا اجماع حجت ہے لیکن نزول قرآن کے موقع پر اس کرّہ ارض پر مومنین صرف اور صرف صحابہ کرام ہی تو تھے۔ اس لیے ان کا اجماع تو بہ طریق اولیٰ دین میں حجت ہے۔

۱۱۴۔ التوبۃ: ۱۰۰

۱۱۵۔ لقمٰن: ۱۰

۱۱۶۔ النساء: ۱۱۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سورۂ انفال کی ابتدائی آیات میں ہے کہ "مومن تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، اور جب ان کے سامنے اس کی آیات پڑھی جاتی ہیں، تو ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں، اور اس میں سے جو ہم نے انہیں دیا ہے خرچ کرتے ہیں اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ O[117] یہی وہ سچے مومن ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس بہت سے درجے اور بڑی بخشش اور باعزت رزق ہے"۔ اسی سورت کے آخر میں ہے کہ "جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں انہوں نے جہاد کیا اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین مکہ کو) جگہ دی اور مدد کی (یعنی انصار مدینہ) اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ" "یہی وہ سچے مومن ہیں ان کے لیے بڑی بخشش اور باعزت رزق ہے"۔ منطقی قیاس میں اگر دو یا دو سے زیادہ جملوں (قضایا) میں کوئی کلمہ یا جملہ مشترک ہو تو اسے منطقی اصطلاح میں حدِ اوسط (Middle term) کہا جاتا ہے جس کے حذف کرنے سے نتیجہ (Conclusion) برآمد ہوتا ہے۔

سورۂ انفال کی مذکورہ بالا ابتدائی اور آخری آیات میں کلمات اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ[118] کی حیثیت حدِ اوسط کی ہے جس کو حذف کرنے سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ مہاجرینِ مکہ اور انصارِ مدینہ سب کے سب وہ مومن ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیات پڑھی جائیں تو ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ کرتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور اس میں سے جو ہم نے انہیں دیا خرچ کرتے ہیں"۔

سورت کی ابتدائی آیات میں: اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا اور وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ کا اضافہ ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ اگر نتیجہ حاصل کرنے کی غرض سے کوئی منطقی حدِ اوسط کو حذف بھی کر دے تو یہ نہ سمجھا جائے کہ (معاذ اللہ) یہ مستقل حذف ہو گئی ہے اور وہ یہ ذہن میں رکھے کہ محض استنتاج (نتیجہ حاصل کرنے) کے لیے ان کلمات کو عارضی طور پر حذف بھی کیا جائے تو

117۔ الانفال: ۲۔۴

© rasailojaraid.com

118۔ الانفال: ۷۴

© rasailojaraid.com

"لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ" کے کلمات پھر بھی بحال ہی رہیں گے۔ یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مذکورہ متعلقہ آیات کو یک جا نہیں لایا گیا ہے بل کہ کچھ آیات کو سورت کی ابتدا میں اور آخری متعلقہ آیت کو سورت کی آخری آیتوں میں لایا گیا ہے۔ ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ درمیان میں بعض آیات میں ان مہاجرین وانصار کو ان کی بعض لغزشوں اور تقصیرات پر تنبیہ کی گئی ہے اور بعض ضروری ہدایات اور نصائح سے انہیں نوازا گیا ہے تاکہ لوگوں کو بہ خوبی معلوم ہو جائے کہ مہاجرین وانصار معصوم عن الخطا نہ ہونے کے باوجود حسنِ عاقبت کی نعمت سے مالا مال ہیں جیسا کہ سورت کے آخر میں متعلقہ آیت لا کر واضح کر دیا گیا ہے۔

سورۂ حدید میں ہے: "تم میں سے جس نے فتح (مکہ) سے پہلے (اللہ کی راہ میں) مال خرچ کیا اور جنگ کی وہ (بعد میں ایسا عمل کرنے والوں کے) برابر نہیں۔ یہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور جنگ کی، وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ[119] " اور اللہ نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کر لیا ہے اور اللہ تمھارے اعمال سے خوب باخبر ہے"۔ یعنی فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے بھی مرحوم و مغفور ہیں اور ان سے بھی اللہ تعالیٰ نے حُسنِ عاقبت کا وعدہ فرمایا۔ سورۂ ممتحنہ میں ہے کہ "بہت ممکن ہے کہ اللہ تمھارے درمیان اور ان کے درمیان جن سے تمھاری (فی الحال) دشمنی ہے۔ محبت پیدا کر دے (کیوں کہ دلوں کا حال بدلنے پر) اللہ قادر ہے اور اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے"[120]۔ یعنی اہل مکہ بھی اسلام قبول کر لیں گے۔ فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والوں کو خود اللہ تعالیٰ نے موکفۃ القلوب قرار دیا ہے کیوں کہ ان کی تالیفِ قلب کے لیے رسول اللہ ﷺ نے غزوہ ہوازن کے تمام غنائم ان میں تقسیم فرما دیے تھے۔ مہاجرین کو بہت کم اور انصار کو کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا۔ تالیفِ قلب ان ہی کی ہو سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرب ہوں۔ جس طرح مہاجرین مکہ کو "مہاجرین" کا اور انصارِ مدینہ کو "انصار" کا لقب خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دیا ہے اسی طرح ان نومسلموں کو جنھوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا "موکفۃ القلوب" کا اعزاز بھی اللہ تعالیٰ نے ہی دیا ہے اور مصارف زکوٰۃ میں موکفۃ القلوب کو بھی شامل کیا ہے۔ اگر وہ فی الحال یا بعد میں منافق و مرتد ہونے والے ہوتے تو عالم الغیب والشہادۃ اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے رسول

119۔ الحدید: ۱۰

120۔ الممتحنۃ: ۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو ان میں غزوۂ ہوازن کے اموال غنیمت تقسیم کرنے کی اجازت نہ دیتا۔ یہ اموال غنیمت تو ان میں تقسیم بھی اسی طرح ہوئے کہ ان اموال غنیمت کے بہ ظاہر اصل مستحقین مہاجرین و انصار میں سے مہاجرین کو بہت کم اور انصار کو تو ایک دانہ بھی نہیں دیا گیا۔ صحابہ کرامؓ مہاجرین و انصار اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے اہل مکہ (مؤلفۃ القلوب) کی فضیلت اور ان کے حسن عاقبت پر مشتمل آیات کا یہاں احاطہ واستیعاب مقصود نہیں ہے، تاہم جو کچھ اوپر لکھا جا چکا ہے عقل رکھنے والوں کے لیے کافی ہے۔

ب: احادیث کی رو سے مقام صحابہ

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسّكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ وإياكم ومحدثات الامور فانّ كلّ محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة۔[۱۲۱]

''سو تم اپنے اوپر میری سنت اور خلفائے راشدینؓ کی سنت کو لازم پکڑو، اس کے ساتھ چمٹ جاؤ اور اسے داڑھوں سے مضبوط پکڑو۔ اور دین میں نئی نئی باتوں سے بچو کیوں کہ (دین کے اندر) ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گم راہی ہے''۔ حضرت حذیفہؓ سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ ''مجھے علم نہیں کہ کب تک میں تم میں زندہ رہوں گا: فاقتدوا بالذين من بعدي ابي بكر و عمر[۱۲۲] ''سو تم میرے بعد ان دونوں ابوبکر اور عمر کی اقتداء کرو''۔ پس جب آپ نے خلفائے راشدینؓ (خصوصاً حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کی سنت کو بھی مضبوطی سے پکڑنے اور ان کی اقتداء کا حکم دیا ہے تو آپ کے حکم سے خلفائے راشدینؓ کی قولی و فعلی سنت کی پیروی دراصل خود رسول اللہ ﷺ ہی کی سنت کی پیروی ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی سنت اور خلفائے راشدینؓ کی سنت میں اگر بہ ظاہر مغائرت پائی بھی جائے تو وہ ہرگز حقیقی مغائرت نہ ہوگی۔ مثلاً شرابی کے لیے رسول اللہ ﷺ نے کوئی حتمی اور متعین حد مقرر نہیں فرمائی تھی بل کہ اسے ہاتھوں، پاؤں اور (بٹ دی ہوئی) چادروں سے مارا پیٹا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ اگر حدود میں سے کسی حد کو جاری کرنے سے مجرم کی جان چلی جائے تو مجھے اس کی پرواہ نہیں لیکن شرابی کی جان ضائع ہو جائے تو میں اس کی دیت دینا پسند کرتا ہوں

۱۲۱ـ ابوداؤد: ج ۲، ص ۲۷۹ـ ترمذی: ج ۲، ص ۹۲ـ مسند احمد: ج ۴، ص ۱۲۷ وغیرہ

۱۲۲ـ ترمذی: ج ۲، ص ۲۰۷ـ ابن ماجہ: ص [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لان رسول اللہ ﷺ لم یسنہ۔ [۱۲۳] "کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی کوئی متعین سزا مسنون نہیں فرمائی"۔ یعنی اس کے متعلق آپ کی کوئی اٹل اور حتمی سنت موجود نہیں، البتہ بعض مواقع پر آپ نے شرابی کو چالیس کوڑوں کی سزا دی تھی۔ چناں چہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں جلد النبی ﷺ اربعین و ابوبکر اربعین و عمر ثمانین و کلٌ سنۃ۔ [۱۲۴] "نبی ﷺ نے شرابی کو چالیس کوڑے لگوائے اور حضرت ابوبکرؓ نے بھی چالیس کوڑے لگوائے اور حضرت عمرؓ نے اسی کوڑے لگوائے اور ان میں سے ہر ایک (کا عمل) سنت ہے"۔ امام حاکمؒ کی روایت میں ہے: ثم اتمہا عثمان ثمانین و کل سنۃ [۱۲۵] "پھر حضرت عثمانؓ نے پورے اسی کوڑے متعین کردیے اور ان میں سے ہر ایک سنت ہے"۔ حاکمؒ کی دوسری روایت میں ہے: ثم جلد عثمان ثمانین و اربعین [۱۲۶] "پھر حضرت عثمانؓ نے اسی کوڑے اور چالیس بھی لگوائے"۔ دیکھیے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی سنت رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سنت سے بہ ظاہر مغائر و مختلف ہے لیکن حضرت علیؓ نے اسے بھی سنت قرار دیتے ہوئے پوری طرح واضح کردیا ہے کہ خلفائے راشدینؓ کی سنت اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں (معاذ اللہ) کوئی حقیقی تعارض نہیں ہے۔ رمضان میں تراویح کی نماز باجماعت کو حضرت عمرؓ نے جو نعم البدعۃ (اچھی بدعت) کہا تو بدعت کا لفظ عربی زبان میں اپنے لغوی معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور اس سے ہر جگہ اصطلاحی بدعت یعنی بدعت شرعیہ مراد نہیں ہوا کرتی۔ بعینہ جیسے "رسول" کا لفظ قرآن کریم میں مثلاً سورہ یوسف میں "قاصد اور ایلچی" کے لغوی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ شاہ مصر نے قید خانے میں حضرت یوسفؑ کے پاس جس قاصد کو بھیجا تھا اسے "رسول" کہا گیا ہے۔ [۱۲۷] یہاں رسول کا لفظ کسی صاحب وحی شخص یعنی اصطلاحی پیغمبر کے معنیٰ میں نہیں ہے۔ بدعت کا اور اللہ تعالیٰ کے صفتی نام "البدیع" دونوں کا مادہ "ب۔ د۔ ع" ہے، پس یہ لفظ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے بہ ذاتِ خود مذموم نہیں ہے۔ "مصنف ابن ابی شیبہ" میں یہ جو روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ کی طرف سے جمعہ کی زائد اذان کو

۱۲۳۔ بخاری: ج۲، ص۱۰۰۶، مسلم: ج۲، ص۷۲

۱۲۴۔ مسلم: ج۲، ص۷۲

۱۲۵۔ حاکم۔ معرفۃ علوم الحدیث: ص۱۸۱

۱۲۶۔ حاکم۔ مستدرک: ج۴، ص۳۷۵

۱۲۷۔ یوسف: ۵۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بدعت کہا ہے[۱۲۸] تو یہاں بھی بدعت سے لغوی بدعت مراد ہے نہ کہ شرعی بدعت۔ چناں چہ یہاں درج ذیل امور توجہ طلب ہیں:

۱۔ ہر بدعت شرعیہ بالاتفاق گم راہی ہے اور اس کا مرتکب گم راہ ہے۔ حال آں کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث فعلیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین میں خلفائے راشدین کو راشدین اور المھدیین (ہدایت یافتہ) قرار دیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص خلفائے راشدینؓ کے کسی عمل کو بدعت قرار دے کر انہیں (معاذ اللہ) بدعتی ٹھہرائے اور رسول اللہ ﷺ خلفائے راشدینؓ کو ہدایت یافتہ قرار دیں تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہی کی بات صحیح ہے۔

۲۔ خلفائے راشدینؓ کے قول و فعل کو خود رسول اللہ ﷺ نے ''سنت'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ بدعت تو سنت کی ضد ہے لہٰذا کوئی خلیفۂ راشد ہرگز بدعتی نہیں ہو سکتا۔ ورنہ ا۔ سے راشد اور مھدی (ہدایت یافتہ) کیسے کہا جا سکتا ہے؟

۳۔ اگر زیر نظر حدیث میں خلفائے راشدینؓ کی سنت سے بعینہ ان کا وہ قول و فعل مراد ہو جس کا صدور و ظہور خود رسول اللہ ﷺ سے بھی لازماً ہوا ہو تو اس میں خلفائے راشدینؓ کی تخصیص ہی کیا رہی؟۔ زید، عمرو، بکر وغیرہ جس کا بھی قول و فعل رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل سے مطابقت رکھتا ہو تو اس کی بھی اتباع نہ صرف درست بل کہ اکثر صورتوں میں مطلوب و مقصود بھی ہو گی۔

۴۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ صحابہ کرامؓ از روئے قرآن امت مسلمہ کا اولین انعام یافتہ طبقہ ہیں۔ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی کے اولین مخاطب حضرات صحابہ کرامؓ ہی ہیں۔ سورۂ فاتحہ میں انعام یافتہ لوگوں کے صراط مستقیم پر ہونے کی وجہ سے ان کا تقابل ان لوگوں سے کیا گیا ہے، جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور جو گم راہ ہیں۔ چوں کہ ہر بدعتِ شرعیہ گم راہی ہے اور اس کا مرتکب گم راہ ہے۔ (گو اس کی گم راہی حدِ کفر تک نہ بھی پہنچتی ہو) لہٰذا بدعت میں ملوث کوئی بھی شخص حقیقی انعام یافتہ یعنی ہدایت یافتہ اور صراط مستقیم پر چلنے والے لوگوں میں شامل نہیں ہو سکتا۔ ادھر صحابہ کرامؓ تو بہ طریق اولیٰ منعم علیہم لوگوں میں شامل ہیں، لہٰذا وہ عموماً اور خلفائے راشدین خصوصاً ہرگز بدعتی نہیں ہو سکتے۔

© rasailojaraid.com

۱۲۸۔ مصنف ابن ابی شیبۃ: ج ۲، ص ۴۰

© rasailojaraid.com

۵۔ حدیث فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین کے آخری کلمات میں رسول اللہ ﷺ نے احداث فی الدین (دین کے اندر نئی باتیں نکالنے) سے جو منع فرمایا ہے اور اسے بدعت قرار دیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ہر بدعت گم راہی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا تقابل آپ نے اپنی سنت اور نیز خلفائے راشدین کی سنت سے بھی فرمایا ہے پس خلفائے راشدینؓ ہرگز احداث فی الدین یعنی بدعت شرعیہ کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ ان کی طرف سے جاری کردہ نئے امور یا تو بہ ذات خود سنت شرعیہ میں داخل ہیں یا ان کے بعض اقدامات احداث للدین (دین کے لیے کوئی نیا کام کرنا) کے تحت ہیں۔ احداث فی الدین تو بالاتفاق بدعت شرعیہ ہے جو مذموم ہے اور جسے گم راہی قرار دیا گیا ہے لیکن احداث للدین (دین کے لیے نئے حالات اور نئی پیش آمدہ ضرورتوں کے مطابق کوئی نیا کام کرنا یا تدابیر و تجاویز اختیار کرنا) خصوصاً خلفائے راشدینؓ کا احداث للدین ہرگز مذموم نہیں بل کہ مطلوب و مقصود ہے اسی لیے خلفائے راشدینؓ کے جاری کردہ نئے امور کی جو بھی نوعیت ہو اسے بہ ہر حال رسول اللہ ﷺ نے بدعت کے مقابل سنت قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ میری سنت کو اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدینؓ کی سنت دونوں کو مضبوطی سے پکڑو۔

۶۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت کے بعد وسنة الخلفاء الراشدین کے کلمات سے خلفائے راشدینؓ کی سنت کا ذکر واؤ عاطفہ سے فرمایا ہے۔ اور عطف میں اصل مغائرت ہے کہ معطوف کو معطوف علیہ کا غیر ہونا چاہیے۔ لہٰذا آپ کی سنت الگ اور خلفائے راشدینؓ کی سنت الگ ہوگی، لیکن چوں کہ آپ نے اپنی اور خلفائے راشدینؓ دونوں کی سنت کے اتباع کا یکساں تاکیدی حکم دیا ہے۔ لہٰذا خلفائے راشدینؓ کے جاری کردہ امور میں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں اگر بالفرض کہیں مغائرت نظر بھی آئے تو یہ صُوری (بہ لحاظ صورت) تو ہوگی، لیکن اسے ہرگز حقیقی مغائرت قرار نہیں دیا جا سکتا جس کی طرف چوتھے خلیفۂ راشد سیدنا حضرت علیؓ نے (مثلاً) شرابی کی حد کے سلسلے میں ''وکل سنۃ'' کے کلمات سے واضح اشارہ فرما دیا ہے۔ فتدبر وتشکر۔

۷۔ بلاشبہ خلفائے راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ فرداً فرداً معصوم عن الخطا نہیں ہیں، لیکن دین کے کسی بھی معاملے میں صحابہ کرامؓ کا اجماع زبردست حجت ہے۔ اسی طرح خلفائے راشدینؓ کی جن سُنن کو صحابہ کرامؓ نے من حیث المجموع زبردست اکثریت سے قبول کیا، اگر وہ معتبر اور حجت نہ ہوتیں تو رسول اللہ ﷺ فرقہ ناجیہ [illegible] کہ یہ لوگ اس راستے پر

© rasailojaraid.com

ہوں گے جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں[۱۲۹] چناں چہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: من کان مستنًّا فلیستن بمن قدمات فانّ الحیّ لا یؤمن علیه الفتنته، أولئک اصحاب محمد صلی اللہ ﷺ کانوا افضل ھذه الامة ابرّھا قلوبا واعمقھا علماء واقلھم تکلّفاً۔ اختارھم اللہ لصحبة نبیه ﷺ ولاقامة دینه فاعرفوا لھم فضلھم واتّبعوھم علیٰ اثرھم وتمسّکوا بما استطعتم من اخلاقھم وسیرھم فانھم کانوا اعلی الھدی المستقیم۔[۱۳۰] ''اگر کوئی شخص کوئی سنت (طریقہ) اختیار کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ ان حضرات کا طریقہ اختیار کرے جو فوت ہو چکے ہیں کیوں کہ جو زندہ ہے وہ کسی (بھی وقت کسی) فتنے میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ یہ (گذشتہ و رفتہ) لوگ اصحاب محمد ہیں۔ یہ اس امت کے افضل ترین لوگ ہیں۔ دل کے سب سے زیادہ نیک اور علم میں سب سے زیادہ گہرے اور سب سے کم تکلف میں پڑنے والے ہیں۔ اللہ نے انہیں اپنے نبی کی صحبت اور دین کے قیام کے لیے چن لیا تھا سو تم اس فضیلت کو چاہتے ہو تو ان کے نقش قدم پر چلو اور تم سے جہاں تک ہو سکے ان کے اخلاق اور ان کی سیرتوں کو مضبوطی سے پکڑو کیوں کہ وہ بلاشبہ صراط مستقیم پر تھے''۔

پس یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ خلفائے راشدینؓ کے غلط فیصلوں پر صحابہ کرامؓ کی اکثریت خاموش رہے اور زبان پر کوئی حرف شکایت تک نہ لائے۔ تو خلفائے راشدینؓ کی طرف سے جاری کردہ امور سے صحابہ کرامؓ کا اجماعی حیثیت سے یا اکثریت کے اعتبار سے اپنے قول و فعل بل کہ سکوت اور خاموشی کے ذریعہ بھی اتفاق کر لینا دین میں اس لیے حجت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے صرف اپنی سنت ہی کے اتباع کا نہیں بل کہ ساتھ ہی خلفائے راشدینؓ کی سنت کے اتباع کا بھی تاکیدی حکم صادر فرمایا ہے اور خلفائے راشدین کو مہدیین (ہدایت یافتہ) قرار دیا ہے۔

الغرض رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بعد خلفائے راشدینؓ نے جو امور نافذ فرمائے ان میں ان کی اتباع کا حکم چوں کہ خود رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہی نے دیا ہے لہٰذا وہ بھی سنت میں ہی شمار ہوں گے۔ مکتبۂ اہل حدیث کے مشہور عالم نواب صدیق حسن خانؒ ارشاد فرماتے ہیں: انّ ماسنه الخلفاء الراشدون من بعده فالاخذ به لیس الّا لامره ﷺ بالاخذ به والاقتداء بما فعلوه ھو لامره ﷺ لنا بالعمل بسنة الخلفاء الراشدین والاقتداء بابی بکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ[۱۳۱] ''رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بعد

۱۲۹۔ جمع الفوائد: ج ۱، ص ۲۹۔ رقم ۱۵۵

۱۳۰۔ جمع الفوائد: ج ۱، ص ۲۷، رقم ۱۳۳

۱۳۱. نواب صدیق حسن خان، [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو امور خلفائے راشدین نے جاری کئے تو انہیں اختیار کرنا محض اس لیے ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے ان امور کو اختیار کرنے کا اور خلفائے راشدینؓ کی اقتدا کا ہمیں یوں حکم دے رکھا ہے کہ آپ نے خلفائے راشدینؓ کی سنت کی پیروی اور (ساتھ ہی) حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کی اقتدا کا (الگ بھی) اشارہ فرمایا ہے"۔

مذکورہ بالا مباحث میں قرآنی آیات اور احادیث سے بہ خوبی معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ امت مسلمہ کا اولین اور افضل ترین طبقہ ہیں۔ انہیں باقی امت کے مقابلے میں یہ امتیازی شان حاصل ہے کہ انہیں حُسن عاقبت کی یقینی بشارتیں دی گئی ہیں، لہٰذا وہ معلوم العاقبۃ ہیں۔ بعد کے لوگوں کی عاقبت کے اچھے ہونے یا نہ ہونے کا یقینی علم اللہ تعالیٰ کو تو ہے لیکن خود لوگوں کو یقینی علم نہیں۔ پس وہ اپنے علم کے اعتبار سے مجہول العاقبۃ ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ سنت کے معنیٰ میں وسعت پیدا کرتے ہوئے اس کے مفہوم میں خلفائے راشدینؓ کی سنت کو خصوصاً اور من حیث المجموع (مجموعی حیثیت سے) صحابہ کرامؓ کی سنت کو بھی عموماً شامل کیا جاتا ہے۔ اہل حق کو اہل السنۃ والجماعۃ کہا جاتا ہے صرف اہل السنۃ ہی نہیں۔ پس اگر صحابیٔ رسول دین کے متعلق کوئی بات کہے یا کوئی کام کرے اور اس کا قول غیر مدرک بالقیاس ہو یعنی یہ تصور بھی نہ کیا جا سکتا ہو کہ اس کا یہ قول و فعل رسول اللہ ﷺ سے علم حاصل کئے بغیر ہو سکتا ہے، تو صحابی کے ایسے قول و فعل کو حدیث مرفوع کی حیثیت حاصل ہو گی۔ اہل حق کا متفقہ فیصلہ ہے کہ صحابہ کرامؓ سب کے سب عدول ہیں، یعنی وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف کسی قول و فعل کی جھوٹی نسبت ہرگز نہیں کرتے نیز کسی بھی دینی امر میں صحابہ کرامؓ کا اجماع زبردست حجت ہے۔ اسی طرح سنتِ رسول کے ساتھ خلفائے راشدینؓ کی سنت کی اتباع بھی مطلوب و مقصود ہے، تو خلفائے راشدین کے جن فیصلوں، احکام و فرامین کو سب صحابہؓ یا ان کی عظیم اکثریت نے قول و فعل یا اپنے سکوت سے قبول کیا ہو تو یقیناً کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ ﷺ یا دونوں میں اس کی اصل اور بنیاد ضرور بالضرور موجود سمجھی جائے گی، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کی فعلی سُنن کا ہر حال میں صرف احادیث کے ذریعے ہم تک پہنچنا ہرگز ضروری نہیں۔ مثلاً صرف نماز ہی کو لیجیے اس کا بالترتیب اور بالتفصیل مکمل طریقے یعنی فقہی اصطلاح کے مطابق اس کی شرائط، ارکان، واجبات، سُنن موکدہ، مستحبات، مباحات، مکروہات، مفسدات، ان میں سے ہر ایک کی تعداد، ہر ایک کی تعریف، ہر ایک کے عمداً یا سہواً چھوٹ جانے کے متعلق پورے پورے احکام او ر مسائل کی پوری پوری تفصیل تو صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث سے بھی نہیں ملے گی۔ اس سے معلوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی بہت سی فعلی سنن یا ان کے متعلق فقہی احکام تعامل صحابہ اور تعامل امت سے بھی ہم تک پہنچے ہیں ان سب کا کتب حدیث میں لفظاً لفظاً مذکور ہونا ضروری نہیں۔

اس تمہید کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ خلفائے راشدینؓ مثلاً حضرت عمرؓ کے بعض اقدامات اور احکام و قضایا سے منکرین حدیث اور دیگر بعض لوگوں نے یہ نہایت ہی غلط نتیجہ اخذ کیا کہ حاکم اعلیٰ کو دینی جزئیات از خود یا لوگوں کے مشورے سے متعین کرنے اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں تغیر و تبدل اور قطع و برید کرنے کی کھلی رخصت حاصل ہو گئی ہے، حال آں کہ جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ خلفائے راشدینؓ کا معاملہ بعد میں آنے والے حکمرانوں سے قطعاً مختلف ہے۔ خلفائے راشدینؓ اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں کوئی حقیقی مغائرت ہے ہی نہیں، اس لیے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدینؓ کی سنت کو بھی اپنے اوپر لازم کرنے کا حکم دیا ہے اور تب ہی تو سورۂ نساء میں صحابہ کرامؓ کے راستے کی پیروی نہ کرنے اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کو ایک ہی چیز قرار دیا گیا ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے خلفائے راشدینؓ کی سنت کی بجائے یہ فرمایا ہوتا کہ میری سنت کو اور میرے بعد آنے والے اپنے ہر ہر حاکم کی سنت کو لازم پکڑو تو اس طرح کے نتائج اخذ کرنے کی کوئی گنجائش ہو سکتی تھی، چوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدینؓ کی سنت کی اتباع کا بھی تاکیدی حکم دیا ہے۔ لہٰذا خلفائے راشدینؓ کی سنت کی پیروی دراصل رسول اللہ ﷺ کی اس قولی سنت ہی کی تو پیروی ہے کہ میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت (دونوں) کو مضبوطی سے پکڑو پس رسول اللہ ﷺ کی سنت اور خلفائے راشدینؓ کی سنت میں کوئی حقیقی مغائرت نہیں ہو سکتی، ورنہ حضرت علیؓ شرابی کی حد کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے چالیس کوڑوں کی سزا اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی طرف سے اسی کوڑوں کی سزا دونوں کے متعلق ہرگز نہ فرماتے "وکل سنۃ" کہ یہ سب شرعی سنت میں ہی داخل ہے۔

ج: حضرت عمرؓ کے بعض اقدامات سے منکرین حدیث کا غلط استدلال

ایسے امور جن کے متعلق منکرینِ حدیث کا دعویٰ ہے کہ ان میں حضرت عمرؓ نے شرعی تبدیلیاں کی ہیں۔ ان میں متعدد امور ایسے ہیں جو خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں اور کچھ امور ایسے ہیں جن کی حیثیت بعض انتظامی اقدامات کی ہے جن سے دینی امور کا نفاذ اور اجرا مقصود ہے نہ کہ حضرت عمرؓ نے دینی مسائل میں کسی ایجاد و اختراع سے کام لیا ہے۔ مثلاً:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ا۔ اذان میں اضافہ: صبح کی نماز میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ احادیث صحیحہ کی رو سے خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ (۱۳۲) حضرت عمرؓ کے پاس ایک شخص صبح کی نماز کی خبر دینے کے لیے آیا۔ آپ سو رہے تھے، اس نے کہا الصلوٰۃ خیر من النوم یا امیر المؤمنین۔ اس پر آپ نے اسے کہا کہ یہ کلمہ اذان کے اندر کہا کرو۔ آپ کا یہ مطلب تھا کہ اس کلمے کا صحیح موقع اسے صبح کی اذان کے اندر کہنا ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دورِ نبوی میں یہ کلمہ اذان میں نہیں کہا جاتا تھا۔ (۱۳۳)

۲۔ قحط کے زمانے میں چوری کی حد کا ساقط ہونا

قحط کے زمانے میں چوری کی سزا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے طور پر موقوف نہیں کی بل کہ اس کا ثبوت سنت نبوی سے ملتا ہے۔ حضرت عباد بن شرحبیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''قحط اور بھوک کی حالت میں میں نے ایک کھیت سے کچھ غلہ لے لیا تو کھیت والے نے مجھے مارا اور میرا کپڑا بھی چھین لیا تو مجھے نبی ﷺ کے پاس لایا گیا اور آپ کو ساری بات بتائی گئی۔ آپ نے کھیت کے مالک سے فرمایا ماعلّمت اذا کان جاھلاً و ما اطعمت اذا کان جائعاً او ساغبا یعنی اگر یہ نادان تھا تو نے اسے تعلیم نہیں دی اور اگر یہ بھوکا تھا تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔ اس پر کھیت والے نے میرا کپڑا بھی واپس کر دیا اور مار کے بدلے ایک وسق یا نصف وسق غلہ بھی مجھے دیا۔'' (۱۳۴) اسی طرح حضرت رافع بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''میں انصار (کے باغات) کی کھجوروں کو پتھر وغیرہ مار کر گرا لیتا او، کھا لیا کرتا تھا تو وہ مجھے پکڑ کر نبی ﷺ کے پاس لے آئے۔ آپ نے مجھ سے پوچھا، اے رافع! تو ان کی کھجوریں کیوں گراتا ہے؟ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! بھوک کی وجہ سے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو اس طرح کھجوریں گرایا نہ کر بل کہ جو از خود گر جائیں تو انہیں کھا لیا کر۔ اللہ تجھے سیر شکم کرے اور تجھے سیراب کرے۔ ایک روایت میں ہے۔ اللّٰھم اشبع بطنہ۔ اے اللہ! اسے شکم سیر کر دے''۔ (۱۳۵)

۱۳۲۔ جمع الفوائد: ج۱، ص۱۱۹، رقم ۱۱۳۶

۱۳۳۔ جمع الفوائد: ج۱، ص۱۲۰، رقم ۱۱۴۴

۱۳۴۔ جمع الفوائد: ۵۶۵۸۱، رقم [illegible]

۱۳۵۔ ایضاً: ج۱، ص۵۶۵، احادیث رقم ۵۴۲۳۔۵۴۲۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ غیر شادی شدہ کے زنا کی حدّ

غیر شادی شدہ زنا کرے تو قرآن کریم میں اس کی حد سو کوڑے ہے۔ حدیث میں اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ زانی کو ایک سال کے لیے جلا وطن بھی کیا جائے۔ احناف یہ کہتے ہیں کہ حدّ تو وہی ہے جو قرآن میں مذکور ہے، اور جلا وطنی حاکم کی صواب دید پر تعزیر ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس سلسلے میں کسی شرعی حکم کو بدل دیا تھا اور جلا وطنی کی سزا کو یک سر ختم کر دیا تھا۔ چناں چہ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ کوڑے لگانے اور جلا وطنی (یعنی حد و تعزیز) دونوں کو نبی ﷺ، ابوبکرؓ اور عمرؓ نے (زانی پر) جاری کیا ہے۔[۱۳۶]

۴۔ حدّ زنا کا اسقاط

اگر کسی عورت سے زنا بالجبر کیا گیا ہو تو عورت پر حد کا جاری نہ کرنا بھی حضرت عمرؓ کی کوئی ایجاد و اختراع نہیں بل کہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”کہ ایسی ہی ایک خاتون کو آپ نے فرمایا تھا اذھبی فقد غفر اللہ لک یعنی تو چلی جا کہ بے شک اللہ نے تجھے معاف فرما دیا ہے اور متعلقہ زانی مرد کو سنگسار کرنے کا آپ نے حکم صادر فرمایا“۔[۱۳۷]

۵۔ قاتل کی وراثت سے محرومی

قاتل کو مقتول کے ترکہ کی وراثت سے محروم کرنے کا فیصلہ بھی خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے یہ کوئی حضرت عمرؓ کی اختراع نہیں ہے بل کہ دیگر متعدد اصحاب کے علاوہ خود حضرت عمرؓ سے بھی روایت ہے کہ ” میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ قاتل کے لیے مقتول کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہے“۔[۱۳۸] حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قاتل وارث نہیں ہوگا“۔[۱۳۹]

۶۔ اُمّ ولد کی خرید و فروخت پر پابندی

۱۳۶۔ ایضاً: ج ۲، ص ۵۵۵، رقم ۵۳۴۳

۱۳۷۔ ایضاً: ج ۲، ص ۵۵۹، رقم ۵۳۶۸

۱۳۸۔ ایضاً: ج ۱، ص ۵۲۴، رقم ۵۰۸۱

۱۳۹۔ مشکاۃ ...

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ پابندی بھی حضرت عمرؓ نے اپنی طرف سے نہیں لگائی بل کہ یہ بھی رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اولاد والی لونڈیوں کو فروخت کرنے سے منع فرمایا کہ نہ وہ بیچی جا سکتی ہیں، نہ ہبہ کی جا سکتی ہیں اور نہ ہی ترکے میں شمار ہو سکتی ہیں۔ ایسی لونڈی کا مالک جب تک زندہ ہے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور جب وہ مر جائے تو لونڈی آزاد ہو گی۔ [(۱۴۰)]

۷۔ طواف میں رمل

طواف کے پہلے تین چکروں میں رمل کیا جاتا ہے جس میں کندھے کھول کر اور ہلا ہلا کر کر ذرا تیز چلا جاتا ہے۔ یہ اس لیے تھا کہ مشرکین مکہ کہتے تھے کہ یثرب (مدینہ منورہ) کی آب و ہوا نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے یہ طریقہ اس لیے تجویز فرمایا کہ کفار کو معلوم ہو جائے کہ مسلمان کمزور نہیں ہوئے ہیں۔ منکرین حدیث کا یہ دعویٰ قطعاً جھوٹا ہے کہ طواف میں اس رمل کو حضرت عمرؓ نے بند کر دیا تھا بل کہ پوری روایت یوں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ”اب کندھے کھول کر اور کندھے ہلا ہلا کر تیز چلنا کس لیے ہے؟ اللہ نے اسلام کو پھیلا دیا اور کفار کو مٹا دیا ہے۔ ولکن مع ذالک لا نزع شیئاً کنا نفعله مع رسول الله ﷺ“۔ اس کے باوجود ہم کسی ایسی چیز کو بھی نہیں چھوڑیں گے جسے ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا کرتے تھے“۔ [(۱۴۱)]

۸۔ مصارف زکوٰۃ

سورۂ توبہ میں زکوٰۃ کے جو آٹھ مصارف مذکور ہیں۔ ان میں ایک مصرف تالیفِ قلب کا بھی ہے کہ نومسلموں کی دل جوئی اور اسلام میں ان کی پختگی کے لیے انہیں زکوٰۃ میں سے رقم دی جاتی تھی۔ ان مصارف زکوٰۃ پر خرچ کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ لازماً ہر ایک مد اور ہر ایک مصرف پر برابر برابر یا بہ یک وقت سب پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جائے۔ یہ حاکم کی صواب دید پر مبنی ایک انتظامی اور تدبیری عمل ہے۔ حضرت عمرؓ نے تالیفِ قلب پر زکوٰۃ کا مال خرچ کرنے کو اس لیے موقوف فرمایا تھا کہ اسلام کے غالب اور کفر کے پوری طرح مغلوب ہو جانے پر اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی کہ نومسلموں کو محض تالیف قلب کے لیے مال دیا جائے۔ ہاں اگر وہ فقرا اور مساکین میں شامل ہوں تو انہیں زکوٰۃ دی جا سکتی

© rasailojaraid.com

۱۴۰۔ جمع القوائد: ج ۱، ص ۵۱۹ رقم ۵۰۴۱

© rasailojaraid.com

ہے اور دیگر فقراو مساکین پر بعض حالات میں انہیں ترجیح بھی دی جا سکتی ہے یہ سب کچھ حاکم کی صواب دید پر چھوڑا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہاں بھی کسی شرعی حکم کو تبدیل نہیں کیا ہے، ورنہ یہ بے ہودہ بات بھی ماننی پڑے گی کہ سنتِ رسول تو ایک طرف رہی، حضرت عمرؓ تو قرآن کریم میں مذکور احکام میں (معاذ اللہ) قطع و برید کو لیا کرتے تھے۔ تالیفِ قلب کی یہ مد معروضی حالات کے تحت موقوف و معطل ہے نہ یہ کہ ہمیشہ کے لیے منسوخ ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے بعض تاریخی روایات کے مطابق تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مال کی اس قدر فراوانی ہو گئی تھی کہ لوگوں کو زکوٰۃ کے لیے فقرا اور مساکین نہیں ملتے تھے اور وہ ایسے اموال (زکوٰۃ کی وصولی پر عاملین کو دینے کے علاوہ) اپنے طور پر بھی بیت المال میں جمع کرا دیا کرتے تھے۔ جس طرح کے حالات میں تالیف قلب کے لیے زکوٰۃ کے اموال خرچ کئے جاتے تھے اگر کسی زمانے میں خدانہ خواستہ ایسے حالات پھر سے پیدا ہوں تو یہ مد بھی بحال ہی سمجھی جائے گی۔ حضرت عمرؓ کے اس انتہائی دانش مندانہ اقدام کا ہی یہ اثر ہے کہ مخالفین اسلام آج یہ جھوٹا دعویٰ تو کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے لیکن یہ نہیں کہتے کہ اسلام گھی کے ڈبے اور آٹے کی تھیلیاں وغیرہ تقسیم کرنے سے پھیلا ہے، جیسا کہ عیسائی مشنری (تبلیغی) ادارے عیسائیت کے پرچار کے لیے کرتے چلے آ رہے ہیں۔

۹۔ مفتوحہ اراضی کا انتظام

رسول اللہ ﷺ نے مفتوحہ اراضی کے متعلق مختلف مواقع پر حسب موقع و ضرورت مختلف فیصلے فرمائے۔ بنو نضیر، بنو قریظہ، خیبر، فدک، وادی القریٰ، مکہ اور طائف کی مفتوحہ اراضی میں سے ہر ایک کا انتظام دور نبوی میں الگ الگ طریقوں سے کیا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا ہرگز ایسا کوئی حکم نہیں تھا کہ مفتوحہ اراضی کو لازماً اور ہر حال میں مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے۔ پس اگر حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں صحابہ کرامؓ کے مشورے سے ان کی کثرت رائے کے پیش نظر مجاہدین میں انہیں تقسیم نہیں کیا تو اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کے کسی فیصلے میں رد و بدل کا کوئی شخصی اختیار حاصل ہو گیا تھا۔ ایسا ہوتا تو وہ ان زمینوں کو بھی مجاہدین سے واپس لے لیتے جو رسول اللہ ﷺ نے ان میں تقسیم فرمائی تھیں۔

۱۰۔ جیشِ اُسامہؓ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیشِ اُسامہؓ کے سلسلے میں حضرت عمرؓ نے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ان کی جگہ کسی اور کو امیر لشکر بنادیا جائے یا اس مہم کو فی الحال ملتوی کر دیا جائے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں ردوبدل میں حضرت عمرؓ کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، کیوں کہ جوں ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دیا تو حضرت عمرؓ سمیت سب کی گردنیں فوراً جھک گئیں۔ کوئی ایک بھی آواز نہیں اٹھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل ہم پر حجت نہیں ہے یا آپ کے انتقال کے بعد ہم پر حجت نہیں رہا۔

۱۱۔ تکبیراتِ جنازہ

نماز جنازہ میں چار تکبیروں کے بارے میں بھی حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو تبدیل نہیں کیا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ''نجاشیؒ شاہ حبشہ کے انتقال کی خبر سن کر صحابہ کرامؓ کے ہم راہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنازے کے لیے نکلے اور آپ ان کے ساتھ جنازہ پڑھنے کی جگہ پر تشریف لے گئے اور آپ نے (نجاشیؒ کے اس جنازے پر) چار تکبیریں کہیں''۔ [۱۴۲]

۱۲۔ گھوڑوں پر زکوٰۃ

شریعت کے مآخذ میں قرآن، سنت، اجماع اور قیاس ہیں جنہیں ادلۂ اربعہ کہا جاتا ہے۔ دورِ نبوی میں گھوڑے صرف جہاد اور سواری کے لیے پالے جاتے تھے۔ ان کی عام تجارت نہیں ہوا کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اسلامی مملکت کو خاصی وسعت حاصل ہوئی۔ اس وسیع و عریض مملکت میں گھوڑوں کی تجارت بھی عام تھی، تو جس طرح تجارتی غرض سے پالے جانے والے جانوروں اونٹ بھیڑ بکری اور گائے پر دور نبوی میں زکوٰۃ تھی، اس پر قیاس کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کے زمانے میں تجارتی گھوڑوں پر بھی زکوٰۃ مقرر کی گئی۔ فقہاء نے تجارتی بھینسوں پر بھی اسی قیاس کے تحت زکوٰۃ مقرر کی ہے حال آں کہ عرب میں بھینسوں کا وجود نہ تھا۔

۱۳۔ زکوٰۃ، جزیہ اور خراج

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زمینی پیداوار پر زکوٰۃ قرآن و سنت دونوں سے ثابت ہے۔ عرب میں دریا نہ ہونے کی وجہ سے دریائی پیداوار نہیں۔ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں دریائی پیداوار والے علاقے اسلامی مملکت کا حصہ بنے اس لیے زمینی پیداوار پر قیاس کرتے ہوئے آپ نے دریائی پیداوار پر بھی زکوٰۃ عائد فرمائی۔

زکوٰۃ کی شرح شرعاً متعین ہے، اس میں تبدیلی کا کسی حاکم کو اختیار نہیں، البتہ غیر مسلموں سے جزیہ لینے کی کوئی شرح متعین نہیں ہے۔ اس میں انتظامی و تدبیری لحاظ سے کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اگر جزیہ کی شرح کو زکوٰۃ کی شرح کے برابر قرار دیا تو یہ محض انتظامی معاملہ ہے۔ اس سے ذمیوں (اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں) کو یہ احساس دلانا بھی مقصود تھا کہ ان سے جزیہ لے کر ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جا رہا کیوں کہ ریاست کے مسلم شہری بھی تو اتنی ہی مقدار میں حکومت کو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔
اسی طرح نومسلم کی غیر منقولہ جائیداد غیر مسلموں کو دینا اور اس کا عوض وظیفے وغیرہ کی صورت میں نومسلم کو دینا بھی حضرت عمرؓ کا محض ایک انتظامی نوعیت کا مسئلہ ہے، جو ہر دور کے حاکم کی صواب دید پر مبنی ہوتے ہیں اور ان سے کسی شرعی ضابطے کی خلاف ورزی نہیں ہوتی، دور نبوی میں خراجی زمینیں نہیں تھیں کہ رسول اللہ ﷺ ان کے خراج متعین فرماتے۔ دورِ فاروقی میں ایسی زرعی اراضی اسلامی مملکت کے اقتدار و تصرف میں آئیں تو انتظام و تدبیر کے طور پر حضرت عمرؓ نے ان اراضی پر خراج عائد فرمایا لیکن اس کی مقرر کردہ شرحوں کو ایسی کوئی شرعی حیثیت حاصل نہیں کہ انہیں کم و بیش یا ختم نہ کیا جا سکے۔

حضرت عمرؓ نے ان غیر مسلم تاجروں پر عشور (ٹیکس) عائد فرمایا جو بہ غرض تجارت اپنے اموال اسلامی مملکت میں درآمد کرتے تھے، کیوں کہ اس طرح کا ٹیکس غیر مسلم ممالک میں مسلمان تاجروں سے بھی لیا جاتا تھا۔ یہ محض ایک انتظامی و تدبیری مسئلہ ہے۔

۱۴۔ غلامی کا مسئلہ

غلامی کو ختم کرنا اسلام کے مقاصد میں شامل ہے۔ حضرت عمرؓ کے اس اعلان سے کہ آئندہ کسی عرب کو غلام نہیں بنایا جائے گا، کسی شرعی حکم کی ترمیم نہیں ہوتی۔ ایسا اعلان تو غلامی کو کم کرنے میں ممد و معاون ہے۔

۱۵۔ تعزیرات کا اجرا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی کی غیبت، تحقیر و تذلیل، اشعار میں کسی کی ناحق مذمت کرنا (ہجو) وغیرہ سب کام شرعاً ممنوع ہیں۔ حاکم کا ایسے کسی بھی کام پر بہ طور تعزیر کوئی اقدام کرنا بالکل درست ہے۔ جو سزائیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں یعنی حدود، ان میں کمی بیشی کا حاکم مجاز نہیں۔ جن سزاؤں میں حاکم کو کمی بیشی کا شرعاً اختیار حاصل ہے انہیں تعزیرات کہا جاتا ہے۔ کسی کی ہجو کرنے، عورتوں کا نام غزل میں ذکر کرنے سے ان کی توہین مقصود ہو یا عام لوگوں میں اس سے توہین کا تصور پایا جاتا ہو تو، اسے لائقِ تعزیر جرم قرار دینا ایک انتظامی ضرورت ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس طرح کے جرائم کی سزائیں متعین فرما کر کسی شرعی ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کی۔

۱۶۔ بعض مُباحات پر عارضی پابندی

بعض مباحات (جائز کام) اگر کسی وقت مفادِ عامہ میں خلل پذیر ہوں تو ان پر وقتی اور عارضی پابندی عائد کرنے کا حاکم کو شرعاً اختیار حاصل ہے بل کہ مفادِ عامہ کے پیش نظر بسا اقدامات ایسے اوقات شرعاً واجب بھی ہیں۔ مثلاً کسی علاقے میں کوئی وبائی مرض پھیل رہا ہو تو اس کی روک تھام کے لیے ایسی غذاؤں اور ایسے سامانِ تجارت پر پابندی ضروری ہو سکتی ہے، جس سے مرض کے مزید پھیلنے کا اندیشہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے کتابیہ (یہودی و عیسائی) عورتوں سے نکاح پر جو پابندی عائد فرمائی تو اس کی نوعیت بھی محدود مدت کے لیے ایک عارضی و عبوری حکم یا آرڈیننس کی تھی۔ ہر حاکم اس کا شرعاً مجاز ہے، اس سے کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

۱۷۔ امتیازی حیثیت میں خلفائے راشدینؓ کے بعض اقدامات

سابقہ مباحث میں بہ خوبی واضح کیا جا چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف اپنی سنت کو بل کہ خلفائے راشدینؓ کی سنت کو بھی مضبوطی سے پکڑنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ شراب نوشی کی سزا میں اضافہ، جمعے کی دوسری اذان، رمضان میں تراویح کی نماز باجماعت کا اہتمام وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ کی سنت کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ بل کہ آپ کے فرمان کے عین مطابق خلفائے راشدینؓ کی سنت بھی چوں کہ واجب التسلیم ہے، لہٰذا ان کے یہ کام بھی سنت شرعیہ ہی میں داخل ہیں۔ جیسا کہ شرابی کی سزا کے سلسلے میں حضرت علیؓ نے "و کلٌ سنۃ" کے کلمات سے واضح بھی فرمایا ہے۔

۱۸۔ وظائف و عطایا کی تقسیم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وظائف و عطایا کی تقسیم میں اگر لوگوں کی ضرورت کے ساتھ ساتھ ان کی خدمات کے پیش نظر کمی بیشی کی جائے تو یہ بھی ایک انتظامی مسئلہ ہے، جس سے کسی شرعی ضابطے کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

۱۹۔ حرمتِ متعہ

متعہ کا جو مفہوم اہل تشیع بیان کرتے ہیں کہ مرد و عورت مقررہ وقت کے لیے مقررہ اجرت پر گواہوں اور ولی کی اجازت کے بغیر باہم ایجاب و قبول کر کے جنسی تعلق قائم کریں جس میں ممتوعہ عورت نان و نفقہ اور مرد سے وراثت کی مستحق نہیں ہوتی اور جو مٹھی بھر گندم دینے سے بھی کیا جا سکتا ہے، تو اس طرح کے متعہ کی کسی بھی شریعت میں کبھی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ اگر ایسے کسی متعہ کی اجازت ہوتی، بل کہ (معاذ اللہ) اس کے فضائل مذکور ہوتے تو قضائے شہوت کا یہ نہایت ہی آسان طریقہ صحابہ کرامؓ میں وسیع پیمانے پر رائج ہوتا اور تواتر سے امت تک منتقل ہوتا۔ اور حضرت عمرؓ کی بھلا کیا مجال ہوتی کہ وہ اسے اپنے طور پر ممنوع قرار دیتے۔ دور جاہلیت کی اس رسم کو تو مکی دور میں ہی ختم کر دیا گیا۔ سورۂ اعراف میں ہے: وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۔ [۱۴۳] ”اور جب وہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا ہے اور اللہ نے اس کا ہمیں حکم دے رکھا ہے (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ کے ذمہ وہ بات لگاتے ہو جو تم جانتے نہیں“۔ چناں چہ متعہ کی بے حیائی کو مکی دور میں ہی ختم کر دیا گیا۔ سورۂ مومنون اور سورۂ معارج (مکی سورتوں) میں ہے ”وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ“[۱۴۴] ”اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، ہاں اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں جن کے وہ مالک ہیں، انہیں کوئی ملامت نہیں جو کوئی اس کے علاوہ (راہ) ڈھونڈے گا تو ایسے لوگ ہی حد سے گزر جانے والے ہیں“۔

© rasailojaraid.com

۱۴۳۔ الاعراف:۲۸

۱۴۴۔ المومنون:۵،۷۔ المعارج:۲۹،۳۱

© rasailojaraid.com

امامیہ حضرات کی کتب سے ثابت ہے کہ جس عورت سے متعہ کیا جارہا ہے وہ چار بیویوں میں شامل نہیں، اور نہ ہی وہ لونڈیوں میں شامل ہے بل کہ یہ تو اجرت پر لی ہوئی عورت ہے۔[۱۴۵] یہی وجہ ہے کہ ایک ہی وقت میں چار سے زیادہ عورتوں سے بھی متعہ کیا جاسکتا ہے جب کہ بیویاں ایک ہی وقت میں چار سے زیادہ نہیں ہوسکتیں۔ پس جب ممتوعہ عورت بیویاں اور لونڈیوں میں شامل ہی نہیں تو ایسی عورت سے جنسی خواہش پوری کرنا مذکورہ بالا آیات کی رو سے حرام اور ممنوع ہے۔ یہ آیات مکی سورتوں کی ہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ سے متعہ کے جائز ہونے کی کوئی روایت نہیں ملتی لیکن اس کے حرام ہونے کی اشاعت بعض وجوہات کی بنا پر پوری طرح نہیں ہوئی تھی۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ متعہ کا کاروبار عام نہیں بل کہ شاذ و نادر صورتوں میں مثلاً لمبے سفر اور جنگوں میں گھر سے دور رہنے اور سفر پر ہونے کی وجہ سے متعہ کیا جاتا تھا اور اس میں باقاعدہ گواہ بھی موجود ہوتے تھے۔ چناں چہ امامیہ کتب میں ہے کہ امام جعفر صادقؒ سے پوچھا گیا، کیا دور نبوی میں لوگ گواہوں کے بغیر متعہ کرتے تھے تو آپ نے فرمایا نہیں۔ علامہ طوسی لکھتے ہیں: انهم ماتزوجوا الّا ببينة وذالك هو الافضل "انھوں نے نکاح متعہ بغیر گواہوں کے کبھی نہیں کیا اور یہی افضل ہے"۔[۱۴۶] چوں کہ اس کے حرام ہونے کی اشاعت وسیع پیمانے پر نہیں ہوئی تھی اس لیے غزوہ خیبر اور بعض دیگر مواقع پر رسول اللہ ﷺ سے متعہ کی ممانعت کی جو روایات ملتی ہیں، تو یہ نہی سابقہ ممانعت کو برقرار رکھنے کے لیے بہ طور تاکید تھی، یعنی یہ نہی تشریعی نہیں بل کہ نہی تاکیدی تھی۔ البتہ فتح مکہ کے موقع پر آپ نے تین دن کے لیے جو اجازت دی تھی وہ بھی اہل تشیع کے مشہور و معروف متعہ کی ہرگز (پھر دہرائیے) ہرگز شکل نہیں تھی، بل کہ یہ نکاح موقت تھا اور اسی کو اس دور میں متعہ کا نام دیا جاتا تھا، جس میں باقاعدہ گواہ بھی ہوتے تھے جیسا کہ اوپر امامیہ کی کتب تہذیب الاحکام اور الاستبصار کے حوالے سے بتایا جاچکا ہے کہ عہد نبوی میں متعہ گواہوں کے بغیر نہیں ہوا کرتا تھا۔ پس اگر کسی روایت میں گواہوں کا ذکر نہ بھی ہو تو عدم ذکر سے عدم وجود ثابت نہیں ہوتا۔ فتح مکہ کے موقع پر نکاح موقت (متعہ) کی جو اجازت صرف تین دن کے لیے دی گئی تھی وہ بھی آئندہ کے لیے تاقیامت ختم کردی گئی۔[۱۴۷] اس کے بعد اگر کسی غزوے مثلاً غزوات حنین، اوطاس اور تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے حرمت متعہ منقول ہے، تو یہ سابقہ ممانعت پر محض

۱۴۵۔ فروع کافی: ابواب المتعۃ، ص ۴۴۸۔ تہذیب الاستبصار ج ۲، ص ۱۸۸

۱۴۶۔ تہذیب الاحکام: ج ۲، ص ۸۶۔ الاستبصار: ج ۳، ص ۱۴۸

۱۴۷۔ جمع الفوائد: ج ۱، ص ۲۳۳، رقم ۴۲۴۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہی تاکیدی ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس نہی سے فوراً پہلے نکاحِ موقت (متعہ) جائز تھا۔ کچھ لوگ سورۂ نساء کی آیتِ نکاح میں فما استمعتم بہ منھن کے بعد "الیٰ اجل مسمّٰی" کی قرأت منسوخہ یا شاذہ سے جواز متعہ پر استدلال کرتے ہیں۔ حال آں کہ اس کے فوراً بعد اگلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ "جو لوگ آزاد مومن عورتوں سے مالی لحاظ سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو وہ مومن لونڈیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت سے متعلقہ احکام وشرائط کے تحت نکاح کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہے "ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْکُمْ ط وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ"[148] "(لونڈیوں سے نکاح کرنے کی) یہ اجازت اس شخص کے لیے ہے جو تم میں سے گناہ میں پڑنے سے ڈرتا ہو اور اگر تم صبر کرو (اور لونڈیوں سے نکاح نہ کرو) تو یہی تمھارے لیے بہتر ہے اور اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے"۔ اسی طرح سورۂ نور میں ہے وَلْیَسْتَعْفِفِ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ نِکَاحًا حَتّٰی یُغْنِیَھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ۔[149] "اور چاہیے کہ وہ لوگ پاکدامنی اختیار کریں جو کوئی نکاح نہیں پاتے یہاں تک کہ اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے"۔ اگر اہل تشیع والے متعے کی کوئی گنجائش ہوتی، جس میں ممتوعہ عورت نان ونفقہ اور وراثت وغیرہ کے حقوق کی مستحق ہی نہیں ہوتی اور جو گندم یا آٹے کی ایک مٹھی پر بھی ہو سکتا ہے اور جو ایک گھنٹے کے لیے بھی ہو سکتا ہے تو خوب غور کیجیے کہ نکاح کی مالی استطاعت نہ رکھنے والوں کو صبر، پاک دامنی اور مالی حیثیت سے غنی ہونے تک کا انتظار کرنے کا حکم دینے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ صاف یہ کہا جاتا کہ ایسے نادار لوگ مٹھی بھر گندم یا آٹا وغیرہ دے کر تھوڑی دیر کے لیے جس خاتون سے چاہیں متعہ کر لیا کریں اور خوب ثواب کمایا کریں۔ پس اگر الی اجل مسمی کی منسوخ یا شاذ قرأت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کا تعلق عقد سے نہیں بل کہ لازماً مہر موٴجل سے قائم کرنا ہوگا کہ جو مہر بوقت نکاح فوری ادا نہ کیا گیا ہو بل کہ بعد میں معینہ مدت پر اس کی ادائیگی کا وعدہ کیا گیا ہو تو ایسی عورتوں سے مہر کی معینہ مدت تک استمتاع (فائدہ اٹھانے یعنی جماع کرنے) کے بعد مہر ادا کر دیا جائے۔ نیز اگر الی اجل مسمّٰی کا تعلق عقد سے ہو اور اس سے مراد متعہ ہو تو لازم آئے گا کہ متعہ کے لیے عمر بھر کی مدت کی تعیین درست نہ ہو حال آں کہ امامیہ حضرات عمر بھر کے لیے بھی متعہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

۱۴۸۔ النساء: ۲۵

۱۴۹۔ النور: ۳۳

© rasailojaraid.com

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اس زمانے کے متعہ (یعنی گواہوں کی موجودگی میں نکاح موقت) کے اِکّادُکّا واقعات لاعلمی کی بنا پر ہوئے تو آپ نے اس کی سختی سے ممانعت کر دی اور متعہ (نکاح موقت) کے حرام ہونے کا عام اعلان فرمایا۔

۲۰۔ بہ یک وقت دی گئی تین طلاقوں کا اجرا

صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ (ایک مجلس کی) تین طلاقوں کو پہلے ایک ہی سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں تینوں نافذ کر دیں۔ (۱۵۰) اس کے متعلق امام بیہقیؒ اپنی سند کے ساتھ امام شافعیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ بعید نہیں کہ ابن عباسؓ سے مروی یہ روایت ایک منسوخ حکم کے متعلق ہو جس کے منسوخ ہونے کا بعض حضرات کو علم نہیں تھا۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک غیر منسوخ حکم معلوم بھی ہو اور پھر بھی وہ دیدہ و دانستہ اس کے خلاف عمل کرتے اور بارہا فتویٰ دیتے رہیں۔ (۱۵۱) چناں چہ سُنن نسائی میں خود حضرت ابن عباسؓ سے ہی یہ روایت موجود ہے کہ پہلے تین طلاقوں کے بعد رجوع ہو سکتا تھا جو بعد میں منسوخ ہو گیا۔ (۱۵۲) اور امام ابوداؤدؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی صحیح مسلم والی روایت کو منسوخ قرار دیتے ہوئے اسے باب بقية نسخ المراجعة بعد التطليقات الثلاثات کے تحت درج کیا ہے۔ (۱۵۳) پس حضرت عمرؓ نے یہاں بھی کسی شرعی حکم میں ہرگز تبدیلی نہیں کی۔ حضرت نافع بن عُجیر فرماتے ہیں کہ "حضرت رکانہ بن عبد یزید رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سُہیمہ کو بتۃ (قطع تعلق کرنے والی) طلاق دی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انہوں نے عرض کیا کہ اللہ کی قسم! میں نے ایک کا ارادہ کیا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا واللہ ماارَدتّ الا واحدۃ؟ فقال رُکانۃ رضی اللہ عنہ واللہ ماارَدتّ الا واحدۃ فردھا الیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فطلقھا الثانیۃ فی عھد عمر رضی اللہ عنہ و الثالثۃ فی زمان عثمان رضی اللہ عنہ" (۱۵۴) "اللہ کی قسم کیا (اے رکانۃ) تو نے واقعی ایک (طلاق) کا ہی ارادہ کیا تھا؟ اس پر رُکانہ نے عرض کیا، اللہ کی قسم میں

۱۵۰۔ مسلم: ج۱، ص۴۷۷۔ مسند احمد: ج۱، ص۳۱۴۔ بیہقی سنن الکبریٰ: ج۷، ص۳۳۶۔ مستدرک: ج۲، ص۱۹۶

۱۵۱۔ محصلہ سنن الکبریٰ: ج:۷، ص۳۳۸

۱۵۲۔ النسائی: ج۲، ص۱۰۳

۱۵۳۔ ابوداؤد: ج۱، ص۲۹۸

۱۵۴۔ ابوداؤد: ج۱، ص۳۰۰۔ مستدرک: ج۲، ص۱۹۹۔ دارقطنی: ج۲، ص۴۳۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا تو آپ نے اس (خاتون) کو اس پر لوٹا دیا۔ پھر رکانہ نے اسے دوسری طلاق حضرت عمرؓ کے اور تیسری طلاق حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں دی"۔ اگر ایک مجلس کی تینوں طلاقیں مؤثر نہ ہوتیں تو حضرت رُکانہؓ سے قسم کیوں لی جاتی؟۔ روایت کے راوی حضرت نافع بن عجیر کو امام ابن حبان ثقہ تابعی قرار دیتے ہیں جب کہ ابوالقاسم بغوی، ابونعیم اور حافظ ابوموسیٰ وغیرہ انہیں صحابی بتاتے ہیں۔[155] پس حافظ ابن قیم کا یہ لکھنا ہرگز درست نہیں کہ نافع بن عجیر مجہول ہیں۔ نیز امام ابوداؤدؒ نے اس حدیث کو اصح (صحیح ترین) قرار دیا ہے۔ اور اس روایت کو مرجوح قرار دیا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت رُکانہؓ نے تین طلاقیں دی تھیں۔ یعنی صحیح ترین روایت یہی ہے کہ تین طلاقیں نہیں بل کہ بتہ (قطع تعلق کرنے والی) طلاق دی تھی۔

یہاں یہ عذر قبول نہیں کیا جاسکتا کہ طلاق ثلاثہ کے سلسلے میں حضرت عمرؓ آخر میں اپنے اس فعل پر نادم ہو گئے تھے۔ ایسا ہوتا تو وہ اپنے حکم کو برملاء واپس لیتے اور اسے منسوخ کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ائمہ اربعہ ہرگز اس پر متفق نہ ہوتے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوں گی۔ اس روایت کا راوی خالد بن یزید بن ابي مالک ہے جس پر اکثر محدثین نے سخت جرح کی ہے۔ امام یحییٰ فرماتے ہیں لیس بشئي یعنی وہ کچھ نہیں ہے۔ امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ نہیں ہے۔ امام دار قطنیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ امام ابوداؤد نے ایک روایت میں اسے ضعیف اور دوسری روایت میں منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ امام یعقوب بن سفیان، حافظ عقیلی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ دو کتابوں کا دفن کر دینا زیادہ مناسب ہے۔ ایک تو عراق میں ابن کلبی کی تفسیر ہے جس میں ابوصالح عن ابن عباسؓ کے طریق سے وہ روایت کرتا ہے اور دوسری کتاب شام میں خالد بن یزید بن ابي مالک کی کتاب الدیات ہے۔ لم یرض ان یکذب علی ابیه حتی کذب علی اصحاب رسول اللہ ﷺ یعنی وہ صرف اس پر راضی نہیں کہ اپنے باپ پر اس نے جھوٹ باندھا بل کہ اس نے تو رسول اللہ ﷺ کے اصحاب پر بھی جھوٹ باندھا ہے۔[156] اگر ایسے غیر معتبر راوی کی روایت کو خواہ مخواہ صحیح بھی قرار دیا جائے تو بھی حضرت عمرؓ کی مبینہ ندامت سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اپنے فیصلے کو غلط سمجھتے تھے ورنہ وہ برملاء اپنے حکم کو واپس لیتے، اگر کوئی شخص تین کے عدد کا ذکر کیے بغیر ایک مجلس میں اپنی بیوی کو کہے کہ تجھے

۱۵۵۔ تہذیب التہذیب: ج ۱۰، ص ۴۰۸

۱۵۶۔ تہذیب التہذیب: ج ۳، ص ۱۲۷۔۱۲۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے تو ممکن ہے کہ اس کا ارادہ ایک ہی طلاق کا ہو اور تین مرتبہ کی تکرار محض تاکیداً ہو۔ ایسی صورت میں دیانتہً (اللہ کے نزدیک) تو ایک ہی طلاق ہوگی مگر معاملہ قاضی کے پاس جائے تو قضاءً (قاضی کے فیصلے کے مطابق) اس سے تین طلاقیں ہی سمجھی جائیں گی۔ حضرت عمرؓ نے چوں کہ ایسی طلاق کو تین ہی شمار کرنے کا حکم دیا تھا، اس لیے ممکن ہے کہ انہیں اس پر ندامت بھی ہو کہ شاید واقعی کسی کا ارادہ ایک ہی طلاق کا ہو لیکن میں دلوں کا حال نہیں جانتا اس لیے اللہ مجھے معاف کرے۔

یہ کہنا بھی ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عمرؓ نے تادیباً (لوگوں کو سزا دینے اور انہیں ادب سکھانے کے لیے) تین طلاقوں کو نافذ کیا تھا۔ شریعت کے کسی حکم کو اس طرح قطعاً تبدیل نہیں کیا جا سکتا ورنہ (معاذاللہ) اس کی بھی پوری گنجائش ہونی چاہیے کہ (مثلاً) کوئی حاکم نماز سے غفلت برتنے والے کسی شخص کو چار رکعت فرض کی بہ جائے تادیباً آٹھ رکعت پڑھنے کا حکم دے۔ حضرت عمرؓ نے اگر تادیباً ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین قرار دیا حال آں کہ شرعاً تین واقع نہ ہوتی ہوں تو یہ شرعی حکم میں تبدیلی ہے۔ تادیب و تعزیر کی اور بھی کئی صورتیں مثلاً ضرب و حبس وغیرہ ہو سکتی تھیں۔ دور حاضر میں تو ایسی تعزیر کی شدید ضرورت ہے، اور اس سلسلے میں مناسب قانون سازی ہونی چاہیے تاکہ تین طلاقیں بہ یک وقت دینے کی حوصلہ شکنی ہو، اور متعلقہ مسائل اور پیچیدگیاں پیدا ہی نہ ہوں۔ ذخیرۂ احادیث میں ہرگز ایسی کوئی حدیث نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک وقت میں دی گئی تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق شمار کرنے کا کوئی حکم دیا ہو۔ حضرت رکانہؓ کے متعلق بعض روایات میں یہ جو کہا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں، اس سے صحیح حدیث کا تقابل کرتے ہوئے امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں 'ھذا اصح من حدیث ابن جریج ان رکانۃ طلّق امرأتہ ثلاثا لانھم اھل بیتہ وھم اعلم بہ'[۱۵۷] "حضرت رکانہؓ کے متعلق یہ روایت (جس میں بتہ کا لفظ موجود ہے) ابن جُریج کی روایت سے زیادہ صحیح ہے جس میں آتا ہے کہ انہوں نے تین طلاقیں دی تھیں کیوں کہ بتہ والی حدیث کو تو ان کے گھر والے بیان کرتے ہیں اور وہ اس کو زیادہ جانتے ہیں"۔ قاضی شوکانیؒ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ واثبت ما روی فی قصۃ رکانۃ انہ طلقھا البتۃ لا ثلاثا[۱۵۸] "حضرت رکانہؓ کے واقعے میں سب سے زیادہ صحیح اور ثابت بات یہی ہے کہ انہوں نے بتہ طلاق دی تھی تین طلاقیں نہیں دی تھیں۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ

۱۵۷۔ ابوداؤد: ج۱، ص۳۰۱، سنن الکبریٰ للبیہقی ۷: ج، ص۳۳۹

۱۵۸۔ قاضی شوکانی، نیل الاوطار: ج۶، ص۲۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعض راویوں نے لفظ بتہ کو تین سمجھ کر غلطی سے ثلاثًا کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (۱۵۹) حضرت عمرؓ نے جب ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو تین ہی قرار دیا تو صحابہ کرامؓ میں سے کسی فرد واحد نے بھی اس پر ہرگز کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کسی کی زبان پر حضرت عمرؓ کے خلاف کوئی حرفِ شکایت نہیں آیا۔ مملکت سعودی عرب نے علمائے حرمین اور دیگر نامور ترین علما پر مشتمل ایک تحقیقاتی مجلس قائم کر رکھی ہے۔ اس مجلس میں تین طلاقوں کا مسئلہ پیش ہوا۔ مجلس نے قرآن و حدیث کی نصوص صریحہ کے علاوہ تفسیر و حدیث کی کوئی سنتالیس کتابوں کے حوالے اور سیر حاصل بحث کے بعد واضح الفاظ میں متفقہ فیصلہ دیا کہ ایک لفظ سے دی گئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی۔ مقالے کا عنوان حکم الطلاق الثلاث بلفظ واحد فی ضوء الکتاب والسنۃ ہے۔ کوئی ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل یہ مقالہ مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کی کتاب احسن الفتاویٰ میں مکمل موجود ہے۔ (۱۶۰)

حضرت عمرؓ کو صحابہ کرامؓ میں ایک خاص امتیازی مقام حاصل ہے۔ کئی ایک قرآنی احکام ان کی رائے اور مشورے کے مطابق نازل ہوئے۔ بعض اوقات انہوں نے انفرادی حیثیت میں رسول اللہ ﷺ کے کسی واضح حکم کی بہ ظاہر شدید مخالفت کی۔ اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے برملا ان کی رائے کی تائید و توثیق فرمائی یا سکوت اختیار فرما کر اسے درست قرار دیا۔ مثلاً ایک موقع پر حضرت ابوہریرہؓ کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے مبارک نعلین (جوتے) عطا فرمائے (تاکہ لوگ حضرت ابوہریرہؓ کی بات پر حیران نہ ہوں بل کہ اسے پورے وثوق اور اعتماد سے بہ غور سنیں) اور انہیں حکم دیا کہ لوگوں میں یہ اعلان کر دو کہ جو شخص بھی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی خلوص قلب سے شہادت دیتا ہے، اسے جنت کی بشارت دی جاتی ہے۔ سب سے پہلے ان کی ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی جنہوں نے سینے پر زوردار ضرب لگا کر انہیں زمین پر گرا دیا اور رسول اللہ ﷺ کے مذکورہ واضح اور کھلے حکم کی تعمیل سے سختی سے روکتے ہوئے انہیں واپس دھکیل دیا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے اپنی اس توہین پر زار وقطار روتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر حضرت عمرؓ کی شکایت کی۔ اتنے میں حضرت عمرؓ بھی وہیں پہنچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے استفسار پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ آپ ایسا نہ کریں کیوں کہ مجھے ڈر ہے کہ لوگ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے (اور احکام شریعت پر عمل میں

۱۵۹۔ نووی، شرح مسلم: ج۱، ص ۴۷۸

© rasailojaraid.com

۱۶۰۔ لدھیانوی۔ مفتی رشید احمد۔ احسن الفتاویٰ: ج۵، ص ۲۲۳۔ ۲۰۰۷، ۳، ایچ۔ ایم سعید کمپنی۔ کراچی

© rasailojaraid.com

کوتاہی کریں گے) اس پر آپ نے فرمایا: تو اچھا لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔[۱۶۱] اسی طرح کی ایک روایت حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے بھی ہے کہ "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ آپ نے فرمایا کہ تم اپنے سے پیچھے لوگوں کو یہ بشارت سنادو کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کی دل سے تصدیق کرتا ہوا (زبان سے) اس کی شہادت دے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ہم جب وہاں سے نکلے تو حضرت عمرؓ سے ہماری ملاقات ہوگئی۔ وہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس لوٹا لائے، اور عرض کیا یا رسول اللہ! اس طرح تو لوگ (عمل چھوڑ کر) اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے (یعنی آپ نے اپنے سکوت سے حضرت عمرؓ کے قول کی تائید و تصویب فرمائی)"۔[۱۶۲] غور کیجیے حضرت عمرؓ کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی اپنے پہلے حکم کو منسوخ ٹھہرایا اور حضرت عمرؓ کی رائے اور مشورے کے عین مطابق اس کی بہ جائے اپنی سنت قولی یا تقریری سے دوسرا حکم صادر فرمایا جو آپ کے پہلے حکم کے لیے ناسخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی گو یہ حقیقت اپنے حال پر برقرار رہی کہ لا الٰہ الا اللہ کی خلوص قلب سے شہادت دینے والا (زود یا بہ دیر) جنت میں داخل ہوگا، لیکن آپ نے حضرت عمرؓ کی اس رائے سے بھرپور اتفاق فرمایا کہ اس حقیقت کا برملا اظہار اور اس کا اعلان فی الحال مناسب نہیں۔

پس اگر یہ ثابت بھی ہو جائے (حال آں کہ ہرگز ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس اور ایک قول کی تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق قرار دینے کا کوئی واضح اور صریح حکم دیا تھا تو بھی حضرت عمرؓ کا اپنے دورِ خلافت میں ایسی تین طلاقوں کو تین ہی قرار دینے کا حکم ہرگز خلاف سنت نہیں سمجھا جائے گا۔ شرابی کے لیے زیادہ سے زیادہ سزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چالیس کوڑوں سے زیادہ ثابت نہیں لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے شرابی کو اسی کوڑوں کی سزا دی جس کے متعلق حضرت علیؓ کا ارشاد ہے: و کلٌّ سنة[۱۶۳] "یہ سب کچھ سنت ہی میں شامل ہے"۔ وجہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اپنی سنت کو ہی نہیں بل کہ خلفائے راشدینؓ کی سنت کو بھی مضبوطی سے پکڑنے کی امت کو تاکید فرمائی ہے۔ یعنی خلفائے راشدینؓ کی جو سنت آپ کی سنت سے بہ ظاہر مغائر نظر آئے اور جسے صحابہ کرامؓ

۱۶۱۔ جمع الفوائد: ج ۱، ص ۷-۸، رقم ۸

۱۶۲۔ ایضاً: ج ۱، ص ۸، رقم ۹

۱۶۳۔ مسلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے بالاتفاق یا عظیم اکثریت سے قبول کیا ہو تو یہ مغائرت اور یہ اختلاف حقیقی نہیں، بل کہ محض ظاہری اور صُوری (بلحاظ صورت) ہے اور اس اختلاف کا کوئی نہ کوئی معقول سبب یقیناً موجود ہے لیکن یہ تو ضروری نہیں کہ بعد کے لوگوں کو اس سبب کا ضرور بالضرور علم بھی ہو سکے۔ اگر ایسے کسی ظاہری اختلاف کو قبول نہ کرنے کا ناحق یہ عذر تراشا جائے کہ آپ کی اور خلفائے راشدینؓ کی سنت میں ہر حال میں عینیت ہونی چاہیے کہ خلفائے راشدینؓ کی صرف وہی سنت مراد ہو جو ہو بہو اسی صورت میں خود رسول اللہ ﷺ سے بھی ثابت ہو تو حدیث میں خلفائے راشدینؓ کی تخصیص (معاذاللہ) قطعاً لایعنی اور بے مقصد ٹھہرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا حکیمانہ کلام اس طرح کے عیب سے پاک ہے کیوں کہ زید، عمرو اور بکر وغیرہ وغیرہ جس کی سنت بھی آپ کی سنت کے عین مطابق ہو تو اس کی بھی اتباع بہ ہر حال مطلوب و مقصود ہوگی خواہ فقہی اصطلاح میں ایسی اتباع فرض، واجب، سنت مؤکدہ، مستحب یا مباح کے درجے میں ہو۔ اب اگر اس مفروضے کو صحیح سمجھ لیا جائے کہ بعض صحابہ کرامؓ حضرت عمرؓ کے مذکورہ فیصلے سے متفق نہیں تھے، گو انہوں نے اس کے خلاف بہ ظاہر کوئی شکایت نہیں کی تو یہ بھی ماننا ہو گا کہ اس اختلاف کی حیثیت ان کے نزدیک اختلاف السنۃ بالسنۃ (سنت کا سنت سے اختلاف) کی ہے، جیسے شرابی کی حد کے سلسلے میں چالیس اور اسی کوڑوں کے اختلاف میں دونوں سزاؤں کو حضرت علیؓ نے سنت ہی قرار دیا ہے۔ اگر تین طلاقوں کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کے نافذ کردہ فیصلے کو صحابہ کرامؓ خلافِ سنت سمجھتے تو ہر گز خاموش نہ رہتے۔

کسی مسئلے پر اجماع سے اگر چند ایک حضرات کو اختلاف بھی ہو تو بھی اس سے اجماع میں خلل پذیر نہیں ہوتا، چناں چہ امام نوویؒ، قاضی شوکانیؒ اور علامہ جزائری لکھتے ہیں کہ داؤد ظاہریؒ کی مخالفت سے اجماع پر کوئی زد نہیں پڑتی۔[۱۶۴] مکتبۂ اہل حدیث کے نامور عالم دین نواب صدیق حسن خانؒ فرماتے ہیں: ولا بتوھم أن المراد بالمجتھدین جمیع مجتھدی الامۃ فی جمیع الاعصار الی یوم القیامۃ فان ھذا توھم باطل لانہ یؤدی الی عدم ثبوت الاجماع۔[۱۶۵] ''اور یہ وہم نہ کیا جائے کہ مجتہدین سے تمام زمانوں میں قیامت تک کے امت کے سارے مجتہد مراد ہیں، کیوں کہ یہ محض باطل وہم ہے اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ کسی بھی مسئلے میں اجماع سرے سے ثابت ہی نہیں ہوگا''۔ اس سے معلوم ہوا کہ طلاق ثلاثہ کے معاملے میں بھی جن حضرات کے اقوال اور فتاویٰ جمہور کے اجماع کے خلاف ہیں وہ سب

۱۶۴۔ نووی۔ شرح مسلم: ج۲، ص ۷۰؛ شوکانی، [illegible] الجزائری، توجیہ النظر: ص ۲۱۲

۱۶۵۔ نواب صدیق حسن خانؒ۔ الجنۃ: ص ۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے سب شاذ اور ناقابل عمل ہیں۔ چناں چہ علامہ احمد بن محمد القسطلانی الشافعیؒ (المتوفی ۹۲۳ ہجری) تین طلاقوں کو ایک سمجھنے والوں کے مذہب کے متعلق لکھتے : بانه مذهب شاذ فلا یعمل به اذهو منکر۔(۱۶۶) "کیوں کہ یہ شاذ مذہب ہے اس لیے اس پر عمل نہیں کیا جائے گا بل کہ یہ ناقابل قبول ہے"۔

مولانا محمد سرفراز خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: "ہمارے نزدیک یہ دونوں طریقے پسندیدہ نہیں، نہ تو ایسے شاذ اور خلافِ اجماع قول پر بے جا اصرار اور ضد ہی بھلی ہے ورنہ کسی بھی اختلافی مسئلے میں (گو وہ مرجوح اور کم زور پہلو کا حامل کیوں نہ ہو جب کہ بعض سلف صالحین سے اختلاف چلا آرہا ہو) دوسرے فریق کی مار پٹائی درست ہے اور نہ اس کو کافر، مرتد قرار دینا اور قابل گردن زدنی قرار دینا صحیح ہے۔ چناں چہ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی ایسے ہی ایک استفتاء کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں: ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے سے تینوں طلاقیں پڑ جانے کا مذہب جمہور علماء کا ہے اور ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں۔ جمہور علما اور ائمہ اربعہ کے علاوہ بعض علماء ضرور اس کے قائل ہیں کہ ایک رجعی طلاق ہوتی ہے اور یہ مذہب اہل حدیث نے بھی اختیار کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ اور طاؤسؒ اور عکرمہ و ابن اسحاق سے منقول ہے۔ پس کسی اہل حدیث کو اس حکم کی وجہ سے کافر کہنا درست نہیں اور نہ ہی وہ مستحق اخراج عن المسجد ہے"۔(۱۶۷)

اس مسئلے کا دورِ حاضر میں مناسب ترین حل یہ ہے کہ ایک ہی مجلس اور ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دینے والے خاوند کے لیے قرار واقعی تعزیر ہونی چاہیے۔ اور اس سلسلے میں مناسب قانون سازی کرتے ہوئے نکاح کے مروجہ رجسٹریشن فارم میں بھی مناسب ترمیم ہونی چاہیے، کیوں کہ ایسا خاوند بہ موجب حدیث نبوی کتاب اللہ کے ساتھ تلاعب (کھیل) کا مرتکب ہوتا ہے۔ حضرت محمود بن لبیدؓ سے مروی ہے :أخبر رسول اللهﷺ عن رجل طلق امرأته ثلاث تطليقات جميعاً فقام غضبانا ثم قال أيلعب بكتاب الله وأنا بين اظهركم حتى قام رجل وقال يا رسول الله ألا اقتله۔(۱۶۸) "رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی عورت کو اکٹھی تین طلاقیں دے

۱۶۶۔ ارشاد الساری طبع مصر ۸/۱۵۷

۱۶۷۔ مفتی کفایت اللہ دہلوی۔ کفایت المفتی [illegible] تاثراتِ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ: ج۲، ص۵۸

۱۶۸۔ نسائی: ج۲، ص۸۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دی ہیں تو آپ غصے میں اٹھ کھڑے ہوئے پھر آپ نے فرمایا کہ میری موجودگی میں اللہ کی کتاب سے کھیلا جا رہا ہے؟ حتیٰ کہ ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا یارسول اللہ! کیا میں اس شخص کو قتل نہ کر ڈالوں؟"۔

۲۱۔ بیس تراویح کا اجرا

رمضان المبارک میں بیس تراویح کے اجرا کے سلسلے میں بھی حضرت عمرؓ نے کسی شرعی حکم میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ دورِ نبوی میں نماز تراویح باجماعت باقاعدگی سے اس لیے نہیں پڑھائی گئی کہ کہیں یہ امت پر فرض نہ ہو جائے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مختصر دورِ خلافت میں اس مسئلے کی طرف توجہ نہ دی جا سکی۔ حضرت عمرؓ نے اس مشروع عمل کا اہتمام فرمایا۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے: ان رسول اللہ ﷺ کان یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ والوتر۔ رسول اللہ ﷺ رمضان میں بیس رکعت تراویح اور وتر پڑھتے تھے۔ (۱۶۹) اس حدیث کے راوی ابراہیم بن عثمان کے ضعیف ہونے پر بعض حضرات نے اعتراض کیا ہے، حال آں کہ ابن ماجہ کی جس حدیث میں صلوۃ الجنازہ میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا مذکور ہے اس کی سند میں بھی یہ راوی موجود ہے مگر ہمارے ان ہی بھائیوں کو وہاں اس راوی پر کوئی اعتراض نہیں۔ نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کا بہ طور ثنا پڑھنا بالکل درست ہے، لیکن نماز تراویح کی بیس رکعات کے برعکس اسے امت میں تلقی بالقبول کا شرف حاصل نہیں، یعنی یہ ایسا کام نہیں جس پر امت مسلسل عمل کرتی چلی آ رہی ہو۔ چناں چہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ "نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا ہمارے شہر مدینہ میں کوئی دستور نہیں"۔ (۱۷۰) طبرانیؒ کی المعجم الصغیر کے آخر میں کوئی بیس صفحات پر مشتمل ایک رسالہ التحفۃ المرضیۃ فی حل بعض مشکلات الحدیثیۃ ہے، جس میں امام شافعیؒ، امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ، علامہ سیوطیؒ، سخاویؒ، اور قاضی شوکانیؒ وغیرہ کے حوالے سے یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جس خبر واحد کو تلقی بالقبول (امت میں قبولیت) حاصل ہو اور خصوصاً جسے امت کا طبقاتی اور عملی تواتر حاصل ہو تو اس کی سند پر بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی، علامہ ابن حزم ظاہریؒ لکھتے ہیں: واذا ورد حدیث مرسل او فی احد ناقلیہ ضعف فوجدنا ذالک الحدیث مجمعاً علی اخذہ والعمل بہ علمنا

۱۶۹۔ مصنف ابن ابی شیبۃ: ج ۲، ص ۳۹۴

۱۷۰۔ مالک بن انس۔ المدونۃ الکبریٰ۔ مصر، ج ۱، ص ۱۷۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یقینا انه حدیث صحیح لا شك فیه۔ [171] "اور جب کوئی حدیث مُرسل ہو یا ایسی کوئی حدیث ہو جس کے ناقلین (راویوں) میں سے کسی میں ضعف ہو لیکن اس حدیث کو لینے اور اس پر عمل کرنے کے سلسلے میں (امت کا) اجماع واقع ہو چکا ہو تو ہم یقیناً یہی جانیں گے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں"۔ یہاں حقیقت تو یہ ہے کہ اگر کوئی خبر واحد ایسی ہو جس کی سند میں کوئی داغ نہ ہو لیکن تعامل صحابہ و امت اس کے خلاف ہو تو یقیناً ایسی روایت کی مناسب تاویل کی جائے گی، اور یہ معمول بہا (جس پر عمل کیا جائے) نہیں سمجھی جائے گی۔ تراویح کا بیس رکعت ہونا بہ لحاظ درایت بھی معقول اور مناسب ہے اولاً رمضان میں تکثیر عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ عام دنوں کی عبادت سے دگنی ہو، دن رات میں ہم پر بیس رکعت نماز فرض اور واجب ہے۔ فجر کی دو رکعت، ظہر کی چار رکعت، عصر کی چار رکعت، مغرب کی تین رکعت، عشاء کی چار رکعت کل سترہ رکعت نماز فرض ہے اس میں وتر کی تین رکعتوں کو شامل کرنے سے بیس رکعت ہوتی ہیں۔ یوں رمضان المبارک میں بیس تراویح سے عبادت دگنی ہو جاتی ہے ثانیاً پانچ اوقات کی نمازوں میں سُنن مؤکدہ و غیرہ موکدہ کی تعداد بھی بیس ہوتی ہے فجر کی دو سنتیں نہ ظہر کی چار رکعت فرض سے پہلے چار رکعت سنت مؤکدہ اور فرض رکعتوں کے بعد مزید دو رکعتیں سنت مؤکدہ عصر کی فرض نماز سے پہلے چار رکعت سنت غیر مؤکدہ، مغرب کی فرض نماز کے بعد دو رکعت سنت مؤکدہ، عشا کی فرض نماز سے پہلے چار رکعت سنت غیر مؤکدہ اور فرض کے بعد دو رکعت سنت مؤکدہ، یوں کل بیس رکعات سنت ہوتی ہیں۔ ثالثاً تراویح کا لفظ ترویحہ (چار رکعات تراویح کے بعد آرام کرنے اور ستانے کا وقفہ) کی جمع ہے۔ عربی زبان میں جمع کم از کم تین افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر آٹھ رکعت بہ طور تراویح پڑھی جائیں تو ہر ترویحہ شمار کرنے سے ہرگز تین ترویحے نہیں ہو سکتے جب کہ بیس رکعت تراویح میں کم از کم چار ترویحے اور اگر وتر سے پہلے بھی ترویحہ ہو تو پانچ ترویحے ہوتے ہیں لہٰذا عربی لغت کے اعتبار سے بیس رکعت کو ہی تراویح کا نام دیا جا سکتا ہے۔ رابعاً بیس رکعت تراویح میں امام اور مقتدی حضرات کو قرآن کریم کے سنانے اور سننے میں نسبتاً زیادہ قیام نہیں کرنا پڑتا۔ خامساً بیس رکعت تراویح سے ستائیسویں شب کو قرآن کریم کا رکوع شماری کے اعتبار سے ختم نسبتہً زیادہ درست اور مناسب رہتا ہے۔ سادساً کوئی بارہ صدیوں تک پوری امتِ مسلمہ بیس رکعت تراویح پر متفق رہی ہے۔ اجماع امت بہ ذات خود دین میں زبردست حجت ہے۔

© rasailojaraid.com

۱۷۱۔ توجیہہ النظر فی اصول الاثر۔ مصر: ص ۵۰

© rasailojaraid.com

ایک ضروری وضاحت

حضرت عمرؓ کے بعض اقدامات کے سلسلے میں منکرین حدیث کے برعکس بعض اہل ظاہر دوسری انتہاء پر چلے گئے۔ اگر بیس رکعت تراویح اور ایک مجلس اور وقت میں دی گئی تین طلاقوں کو تین قرار دینے سے کسی کو اختلاف ہو تو سلامتی اسی میں ہے کہ ایسے حضرات اس اختلاف کو اختلاف السنتہ بالسنتہ (سنت کا سنت سے اختلاف) کے عنوان کے تحت ایسے ہی قرار دیں جیسے چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علیؓ نے شرابی کے لیے چالیس اور اسی کوڑوں کی سزا کے اختلاف میں دونوں کو سنت قرار دیتے ہوئے فرمایا تھا وکل سُنۃ۔ اگر حضرت عمرؓ کے ایسے اقدامات کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) خلافِ سنت قرار دیا جائے تو لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے ایسے اقدامات کے خلافِ سنت ہونے کا علم اکابر صحابہ مہاجرین وانصار کو بھی تھا یا نہیں تھا؟۔ اگر نہیں تھا تو سیکڑوں برس کے بعد کے لوگوں کو یہ علم کہاں سے حاصل ہو گیا؟۔ اگر منکرینِ حدیث کا چودھویں صدی ہجری میں یہ انکشاف ایک زبردست اضحوکہ ہے کہ احادیث کا پورا ذخیرہ "عجمی سازش" ہے تو سیکڑوں برس بعد کسی کو یکایک یہ انکشاف ہوا ہو کہ بیس تراویح کا نفاذ تو خلافِ سنت تھا اور لگاتار سیکڑوں برس تک اگر عالم اسلام میں کہیں بھی اور کسی بھی ایک مسجد میں متبادل آٹھ رکعت تراویح نہیں پڑھی گئیں، اور یہ سب کچھ خلافِ سنت ہوتا رہا تو یقیناً ایسا "انکشاف" بھی دل چسپ اضحوکہ ہی ہے اگر مہاجرین وانصار صحابہ کرامؓ کو یہ علم تھا کہ حضرت عمرؓ کے یہ اقدامات خلاف سنت ہیں یا وہ یقیناً اجتہادی غلطی پر ہیں، تو مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلافِ سنت کام "معروف (نیکی)" میں شامل ہے یا اسے "منکر (برائی)" میں شامل کیا جائے گا۔ اگر معروف میں شامل ہے تو اس کی وضاحت مطلوب ہے اگر یہ "منکر" میں شامل ہے تو مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکابر صحابہ کرامؓ نے عموماً اور حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ نے خصوصاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا تھا یا نہیں ؟۔ اگر نہیں تو کیا سارا قرآن (معاذ اللہ) اسی طرح کے صحابہ کرامؓ کی مدح وتوصیف سے بھرا پڑا ہے ؟ اگر فریضہ انجام دیا تھا تو کیا حضرت عمرؓ نے اپنے اقدامات سے برسرعام رجوع کا اعلان فرمایا تھا یا نہیں ؟۔ اگر رجوع فرمایا تھا تو وضاحت مطلوب ہے۔ اگر نہیں فرمایا تھا تو وہ خلیفۂ راشد کیسے ہوئے ؟ اگر یہ کام خلاف سنت تھے تو بعد میں آنے والے خلفائے راشدینؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے انہیں برسرعام کالعدم قرار دیا تھا یا نہیں ؟ اگر نہیں تو وہ بھی خلفائے راشدینؓ کیسے ہو گئے ؟ اگر برسرعام انہوں نے ایسا کوئی اعلان فرمایا تھا تو اس کی وضاحت اور نشان دہی مطلوب ہے۔ یہ سوال بھی یہاں پیدا ہوتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے خلاف سنت کام کرنے اور کرانے والے خلفا کے متعلق ارشاد فرمایا تھا کہ تم میری اور میرے خلفائے راشدینؓ کی سنت کو لازم پکڑو۔ میرے بعد ابوبکر اور عمر کی اقتدا کرو وغیرہ؟ جمہور اہل علم کا قول تو یہی ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس طرح کے تمام اقدامات کے صحیح ہونے پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ اگر امت مسلمہ کے شاید دو فیصد سے بھی کم کچھ حضرات کا یہ خیال ہو کہ صحابہ کرامؓ کا ان اقدامات پر اجماع نہیں تھا، تو لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انہوں نے حضرت عمرؓ سے اپنے اختلاف کو اجتہادی اختلاف سے زیادہ کچھ اور قرار نہیں دیا ہوگا اور اجتہادی اختلاف میں کوئی فریق بھی موردِ طعن نہیں ہوتا ورنہ اس باطل تصور پر اگر اصرار کیا جائے کہ حضرت عمرؓ کے یہ اقدامات یقیناً خلاف سنت تھے یا یہ ان کی ایسی (مبینہ) اجتہادی غلطی تھی جس کا صحابہ کرام کو یقین بھی تھا پھر بھی وہ اس پر خاموش رہے تو حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم تینوں کو (معاذاللہ ثم معاذ اللہ) خلفائے راشدین نہیں کہا جا سکتا، بل کہ دیگر صحابہ کرامؓ کو بھی ہرگز عدول نہیں سمجھا سکتا۔ اگر تلقی بالقبول، تعامل امت اور تعامل صحابہؓ سے پہنچنے والے کسی دینی امر میں اخبار آحاد کے حوالے سے شبہات پیدا کرنے یا انکار کی گنجائش ہو تو خدانہ خواستہ ایسا زمانہ بھی آسکتا ہے کہ اسی طرح کے تواتر سے پہنچنے والی قرآنی آیات کے متعلق بھی ہر ہر آیت کے لیے مرفوع احادیث تلاش کی جائیں، بل کہ اگر کوئی ایسی حدیث موجود ہے تو اسے (معاذ اللہ) کتاب اللہ پر ترجیح دی جائے یا اسے درست اور کتاب اللہ کی متعلقہ آیت کو نادرست سمجھا جائے۔ مثلاً اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم اور ترمذی میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہما سورۃ اللیل کی آیت: وما خلق الذکر والانثیٰ کو والذکر والانثیٰ پڑھا کرتے تھے۔[۱۷۲] چوں کہ یہ خبر واحد ہے اور ان متواتر قراتوں کے خلاف ہے جو خود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد قُرا سے منقول ہیں، لہٰذا اسے قرأت شاذہ قرار دیا گیا ہے، جو قرأت متواترہ کے مقابلے میں ناقابل قبول ہے۔ بعینہ اسی طرح کوئی خبر واحد خواہ بہ اعتبار سند کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو اگر تعامل صحابہ اور تعامل امت کے خلاف ہو تو وہ منسوخ یا مؤوّل سمجھی جائے گی اور اس پر عمل متروک ہوگا۔ تعاملِ صحابہ اور تعامل امت کے مقابلے و معارضے میں اخبار آحاد کے بارے میں اس افراط (غلو) کو بھی منکرین حدیث کی اس تفریط (تنقیص) کا ایک سبب قرار دیا جاسکتا ہے کہ وہ سرے سے ہی اخبار آحاد کی حجیت کے منکر ہوگئے۔

© rasailojaraid.com

۱۷۲۔ جمع الفوائد: ج۲، ص ۲۳۹، رقم ۶۴۳۹، ۶۴۴۰

© rasailojaraid.com

چوتھا حصہ: عقائد اسلام اور پرویزی منکرین حدیث

ایمان بالغیب

سورۂ بقرہ میں متقین کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اہل حق کے نزدیک بالاتفاق اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ متقین (پرہیزگار لوگ) ان غیبی امور پر یقین رکھتے ہیں جن کا ادراک صرف عقل و حواس سے ممکن نہیں جیسے ذات باری تعالیٰ، وحیِ الٰہی، جنت و جہنم، ملائکہ، حیات بعد الممات وغیرہ۔ اللہ اور رسول کی بتلائی ہوئی ان باتوں پر یقین رکھنا جزوِ ایمان ہے اور ان کا انکار کفر و ضلالت ہے۔ پس قرآن کریم تاقیامت ان پرہیزگار لوگوں کے لیے کتاب ہدایت ہے، جو ان امور غیبیہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان غیبی امور کا مشاہدہ اس دنیا میں نہیں بل کہ عالم آخرت میں ہوگا۔ لیکن مسٹر غلام احمد پرویز نے ایمان بالغیب کا مفہوم یوں بیان کیا ہے "خدا کے نظام ربوبیت کے ان دیکھے نتائج پر ایمان رکھنا"۔[۱۷۳] باخبر حضرات سے یہ امر مخفی نہیں کہ پرویز صاحب کی خود ساختہ اصطلاح "نظام ربوبیت" سے مراد معیشت کا "اشتراکی نظام" ہے، جس میں تمام ذرائع پیداوار ریاست کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور ریاست کے کسی بھی فرد کے لیے انفرادی اور نجی ملکیت کا کوئی جواز نہیں۔ یوں پرویزی مفہوم کے مطابق قرآن کریم ان لوگوں کے لیے ہی کتاب ہدایت ہے جو ان کے خود تراشیدہ نظام ربوبیت کے ان نتائج پر ایمان و یقین رکھتے ہوں جو فی الحال، تو حالتِ غیب میں ہیں مگر بعد میں کبھی نمودار ہوں گے۔ پس جب (مفروضہ) اشتراکی نظام قائم ہوجائے گا تو اس کے نتائج و ثمرات تو اسی دنیا میں ظاہر و نمایاں ہوجائیں گے وہ تو سب کے سامنے محسوس و مشاہد ہوں گے لہٰذا پرویزی فکر کے مطابق قرآن کریم بھی (معاذ اللہ) اس لائق ہوگا کہ اسے کسی عجائب گھر میں رکھ دیا جائے۔ بہ الفاظ دیگر پرویزی منکرین حدیث کے مجوزہ اشتراکی نظام معیشت کا تعلق صرف اس دنیا سے ہے۔ اگر یہ نظام دنیا میں قائم اور نافذ ہوجائے تو اس کے ثمرات و نتائج امور غیبیہ میں شامل ہی نہیں رہیں گے لہٰذا پرویزی فکر کے مطابق قرآن کریم بھی (معاذ اللہ) مستقبل کے لیے کتاب ہدایت نہیں رہے گا بل کہ اس کی حیثیت تاریخی یادداشت کی رہ جائے گی۔

اللہ پر ایمان

© rasailojaraid.com

۱۷۳۔ غلام احمد پرویز۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۸۸

© rasailojaraid.com

منکرینِ حدیث کے لٹریچر میں لفظ ''اللہ'' کے متعدد ایسے معانی ملتے ہیں جن کا باہم کسی طرح کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ اس سے ان کے ایمان باللہ (اللہ پر ایمان) کی حقیقت از خود نمایاں ہو جاتی ہے۔ منکرین حدیث کے بیان کردہ مفہوم اور ترجمے کے بعد ہم نے متعلقہ قرآنی آیات و کلمات کا صحیح ترجمہ بھی تقابل کے لیے لکھ دیا ہے:

الف: اللہ بمعنیٰ ''نظام ربوبیت''

وَاللہُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَۃً مِّنۡہُ وَفَضۡلًا۔[۱۷۴] پرویزی مفہوم: ''نظام ربوبیت تمہیں پوری پوری حفاظت کا یقین دلاتا ہے اور رزق کی فراوانیوں کی ضمانت دیتا ہے''۔[۱۷۵] صحیح ترجمہ: ''اور اللہ تم سے اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے''۔

ب: اللہ بہ معنیٰ ''اللہ کا قانون''

حَسۡبُکَ اللہُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ۔[۱۷۶] پرویزی مفہوم: ''تمھارے لیے اس ٹکراؤ میں جو مفاد پرست جماعتوں سے ہونے والا ہے اللہ کا قانون اور اس جماعت کی رفاقت کافی ہے''۔[۱۷۷]

پوری آیت اور اس کا صحیح ترجمہ یوں ہے: یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ حَسۡبُکَ اللہُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ''اے نبی! اللہ تجھے کافی ہے اور ان مومنوں کو بھی جو تیری پیروی کرتے ہیں''۔

رَضِیَ اللہُ عَنۡہُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ[۱۷۸] پرویزی مفہوم: ''انہوں نے قانون خداوندی سے موافقت پیدا کر لی اور قانون ان کا رفیق و یاور بن گیا''۔ صحیح ترجمہ: ''اللہ ان سے راضی ہو اور وہ اللہ سے راضی ہوئے''۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً[۱۷۹]

پرویزی مفہوم: ''کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ اللہ کا قانون بادلوں سے پانی برساتا ہے''۔[۱۸۰] صحیح ترجمہ: کیا تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا''۔

۱۷۴۔ البقرۃ: ۲۶۸

۱۷۵۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۷۵

۱۷۶۔ الانفال: ۶۴

۱۷۷۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۱۷

۱۷۸۔ التوبۃ: ۱۰۰

۱۷۹۔ فاطر: ۲۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(ج) اللہ بہ معنیٰ "اللہ کا نظام"

وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔[181] پرویزی مفہوم: "کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ناسمجھی سے اس نظام کو خدا کا نظام سمجھنے لگ جاؤ"۔[182] پوری آیت اور اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے: اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ "وہ (شیطان) تمہیں صرف برائی اور بے حیائی کا اور اللہ پر ان باتوں کے کہنے کا حکم دیتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں"۔ یعنی اللہ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے کا حکم دیتا ہے۔

د: اللہ بہ معنیٰ "صفات خداوندی"

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔[183] پرویزی مفہوم: "صفاتِ خداوندی میں حُسن کا لانا توازن ہے"۔[184] آیت کا متعلقہ حصہ اور اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے: وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا "اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں سو ان ناموں سے تم اسے پکارا کرو"۔

ہ: اللہ بہ معنیٰ "؟"

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ[185] پرویزی مفہوم: "زندگی کا ہر حسین نقشہ اور کائنات کا ہر تعمیری گوشہ خالقِ کائنات کے عظیم القدر نظام ربوبیت کی ایسی زندہ شہادت ہے جو ہر چشم بصیرت سے بے ساختہ دادِ تحسین لے لیتی ہے"۔[186] مذکورہ بالا پرویزی مفہوم میں لفظ "اللہ" کا ترجمہ اگر قارئین کرام کو نہ ملے تو ہم ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟۔ صحیح ترجمہ: سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سب جہانوں کا پروردگار ہے"۔

۱۸۰؛ طلوع اسلام: فروری ۱۹۵۲ء ص ۴۳

۱۸۱۔ البقرہ: ۱۶۹

۱۸۲۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۲۵

۱۸۳۔ الاعراف: ۱۸۰

۱۸۴۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۱۷

۱۸۵۔ فاتحہ: ۱

۱۸۶۔ غلام احمد پرویز، مفہوم القرآن: ص ۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

و: اللہ و رسول بہ معنیٰ "مرکز ملت"

قرآن کریم میں جہاں بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کا اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے تو منکرین حدیث کے نزدیک اللہ اور رسول سے مراد "مرکز ملّت" یعنی حاکم اعلیٰ ہوا کرتا ہے اور کبھی اللہ کے ساتھ رسول کو لگائے بغیر صرف اللہ سے بھی "مرکز ملّت" مراد ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے: وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ اِلَّا اللّٰہ [۱۸۷] "اور گناہوں کو اللہ کے سوا اور کون بخشتا ہے؟"۔ لیکن منکرینِ حدیث کے ادارہ طلوع اسلام کے ایک معزز رکن ڈاکٹر عبدالودود صاحب فرماتے ہیں "اگر کسی فرد سے لغزش ہو جائے تو مسجد کے گوشے میں "استغفر اللہ" کہنے سے معافی نہیں مل سکتی بل کہ اس فرد کو خود چل کر مرکزی اتھارٹی کے پاس آنا ہوگا اور معذرت پیش کرنا ہوگی"۔ [۱۸۸] یعنی منکرین حدیث کا مرکز ملت عیسائیوں کے پوپ کی طرح لوگوں کے گناہ معاف کرنے کا مجاز ہے اس لیے کسی کو استغفر اللہ (میں اللہ سے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں) کہنے سے بہ قول ڈاکٹر عبدالودود ہرگز معافی نہیں ملے گی بل کہ اسے مرکز ملّت کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ کہنا ہوگا کہ میں آں جناب سے معافی کا خواست گار ہوں۔ لفظ "اللہ" کے مذکورہ بالا متعدد پرویزی معانی پر غور کیجیے، جب کسی کو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ "اللہ" سے ان منکرینِ حدیث کی مراد کیا ہے تو ایمان باللہ کے پرویزی مفہوم کو ٹھیک سمجھ پانے کی سعادت بھلا کس دانش ور کو حاصل ہو سکتی ہے؟

فرشتوں پر ایمان

ملائکہ (فرشتوں) سے کیا مراد ہے، اس کے متعلق ماڈرن ملا غلام احمد پرویز کے ارشادات ان کے ذہنی انتشار و اضطراب کے اس طرح غماز ہیں کہ پڑھنے والے کو "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" والی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً:

الف: ایک مقام پر وہ ارشاد فرماتے ہیں "ملائکہ سے مفہوم وہ قوتیں ہیں جو کائنات کی عظیم الشان مشینری چلانے کے لیے مامور ہیں یعنی قوائے فطرت اس لیے قانون خداوندی کی زنجیر کے ساتھ جکڑی

۱۸۷۔ آل عمران: ۱۳۵

۱۸۸۔ طلوع اسلام: جولائی ۱۹۶۴ء (طلوع اسلام کنونشن میں ڈاکٹر عبدالودود کا خطاب)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئی ہیں کہ ان سے انسان کام لے سکے۔ اسی لیے قصہ آدم میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ نے آدم کو سجدہ کر دیا۔ مطلب یہ کہ فطرت کی قوتیں انسان کے تابع فرمان کر دی گئی ہیں"۔ (۱۸۹) اگر پرویزی مفہوم کے مطابق ملائکہ سے مراد کائنات میں کارفرما خارجی قوتیں ہیں تو قوانین فطرت کو معلوم کر کے ان سے حسب استعداد کسی حد تک مستفید ہونا تو انسانوں کے اختیار میں ہے لیکن یہ کہنا سراسر خلافِ حقیقت اور خلاف مشاہدہ ہے کہ سب ہی قوانین فطرت پر انسان کو عبور حاصل ہو گیا ہے اور یہ سب قوتیں اس کے تابع مہمل ہو گئی ہیں۔ فطرت کی یہ قوتیں بسا اوقات انسان کو شدید نقصانات اور مصائب و آلام سے بھی دوچار کرتی ہیں۔ طوفانِ باد و باراں، زلزلوں، قحط سالی جیسی ارضی و سماوی آفات سے سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ کیا ان ہی قوتوں نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کیا تھا؟ قوانین فطرت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے کام میں لگا رکھا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ خالق کی بہ جائے مخلوق کے تابع ہو گئے ہیں۔ اجرام سماوی کی چال، شمس و قمر اور دیگر کواکب اور سیاروں کی چال اور ان کا طلوع و غروب، ہواؤں کا چلنا، بارش کا برسنا وغیرہ امور پر انسان کا کوئی اختیار نہیں۔ قرآن کریم میں یہ جو مذکور ہے کہ اللہ نے سورج اور چاند، رات اور دن کو تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے تمھارے کام میں لگا رکھا ہے۔ یہ نہیں کہ قوانین فطرت پر انسان کو مکمل اختیار سونپ دیا گیا ہے کہ ہر انسان جو چاہے کر سکے۔ ہماری بے بسی کا حال تو یہ ہے کہ ہم اپنی ایک ٹانگ تو زمین سے اٹھا سکتے ہیں لیکن دوسری ٹانگ کو اٹھانا ہمارے بس میں نہیں۔ چھلانگ بھی لگائیں گے تو زمین پر واپس آنے پر ہم مجبور ہیں۔

ب: ایک اور مقام پر ملائکہ کا مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے "...... لہٰذا یہ ملائکہ ہماری داخلی قوتیں ہیں یعنی ہمارے اعمال کے اثرات جو ہماری ذات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں اور جب انسانی اعمال کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں قرآن اسے قیامت سے تعبیر کرتا ہے"۔ (۱۹۰)

غور کیجیے ملائکہ کا ایک مفہوم تو "خارجی قوائے فطرت" تھا، اب اس دوسرے مفہوم میں ملائکہ یکایک "انسان کی داخلی قوتوں" کا روپ دھار گئے۔ پرویزی وسعتِ فکر کا یہ عالم ہے کہ ساتھ ہی "قیامت" کا مفہوم بھی بیان فرما دیا کہ اس سے مراد انسانی اعمال کے وہ نتائج و اثرات ہیں جو محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں۔ مثلاً آپ حفظانِ صحت کے اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اچھی غذا کھائیں، کھلی ہوا

۱۸۹۔ غلام احمد پرویز۔ ابلیس و آدم: ص ۱۴۲

© rasailojaraid.com

۱۹۰۔ ابلیس و آدم: ص ۱۶۲

© rasailojaraid.com

میں ورزش کریں، روزمرہ کے تفکرات اور پریشانیوں سے دور رہنے کے اسباب اختیار کریں اس سے آپ کی صحت بہتر ہو جائے، جسمانی وزن میں اضافہ ہو جائے، چہرے پر سرخی اور چمک دمک آجائے تو بس آپ کی قیامت آگئی۔

ج: ایک اور مقام پر ملائکہ کا مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے "ان مقامات (یعنی بدر کے موقع پر تین ہزار ملائکہ کا نزول یا ایسی ہی دوسری آیات) پر غور کیجیے۔ "ملائکہ کی مدد" کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس سے جماعت مومنین کے دلوں کو تسکین ملی تھی اور ان کے عزائم پختہ ہو گئے تھے۔ دوسری طرف دشمنوں کے دل خوف زدہ ہو گئے تھے اور ان کے حوصلے چھوٹ گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں ملائکہ سے مراد وہ نفسیاتی محرکات ہیں جو انسانی قلوب میں اثرات مرتب کرتے ہیں"۔[(۱۹۱)] پرویز صاحب کی پوری کوشش یہ ہے کہ ملائکہ کے ایسے نئے نئے اور عجیب و غریب مفہوم تلاش کیے جائیں جن سے ملائکہ کے خارجی وجود سے انکار کی راہ ہموار ہوتی چلی جائے، لیکن یہاں دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مثلاً غزوۂ بدر کے شرکاء کی مشہور تعداد تین سو تیرہ تھی۔ ان کے لیے ایک ہزار، پھر تین ہزار اور اس کے بعد پانچ ہزار فرشتوں کے نزول سے مراد اگر داخلی نفسیاتی محرکات ہیں تو فی کس ان کی تعداد (۵۰۰۰ تقسیم ۳۱۳) = ۱۵ء۹۷ یعنی بہ تکمیل کسر سولہ ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کہ شرکائے بدر کے دلوں کی مضبوطی کے لیے کس نوعیت کے سولہ سولہ نفسیاتی محرکات ان میں تقسیم ہوئے تھے؟

د: ملائکہ ایک اور مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے "ان مقامات سے ظاہر ہے کہ جو طبعی تغیرات انسان کے جسم میں رونما ہوتے ہیں اور جن کا آخری نتیجہ انسان کی طبعی موت ہوتی ہے انہیں بھی ملائکہ کی قوتوں سے تعبیر کیا گیا ہے"۔[(۱۹۲)] جن طبعی تغیرات کا سلسلہ پیدائش سے موت تک چلتا ہے، انہیں عام لسانی محاورات میں بچپن، جوانی، بڑھاپے اور بالآخر موت کا نام دیا جاتا ہے۔ ملائکہ سے مراد خارجی قوائے فطرت ہوں، انسان کی داخلی قوتیں ہوں، نفسیاتی محرکات یا طبعی تغیرات ہوں، ان کا انکار تو دہریے بھی نہیں کرتے، تو اہل ایمان کو ملائکہ پر ایمان لانے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ (معاذ اللہ) سراسر عبث دکھائی نہیں دیتا؟ نیز ان تمام چیزوں کے لیے جب لغت میں الفاظ و کلمات پہلے سے ہی موجود تھے تو انہیں "ملائکہ" کا نیا نام دینے کے بیجا تکلف کی آخر ضرورت ہی کیا تھی؟

۱۹۱۔ ابلیس و آدم، ص ۱۵۵

© rasailojaraid.com

۱۹۲۔ ایضاً

© rasailojaraid.com

ھ: ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کے عرش کو اٹھانے والے ملائکہ کے متعلق پرویز صاحب لکھتے ہیں،

"عرش وہ مرکزِ حکومت خداوندی ہے، جہاں کائنات کی تدبیر امور ہوتی ہیں اور چوں کہ تدبیر امور ملائکہ کی وساطت سے سرانجام پاتی ہے اس لیے ملائکہ عرش الٰہی کے اٹھانے والے اور کمربستہ اس کے گرد گھومنے والے ہیں"۔ (۱۹۳) ایک طرف تو پرویز صاحب اس سعی نامشکور میں مصروف و مشغول نظر آتے ہیں کہ ملائکہ کے خارجی وجود سے انکار کی راہ ہموار کی جائے لیکن یہاں وہ نامعلوم وجوہ کی بنا پر ملائکہ کے خارجی وجود کو تسلیم کرتے نظر آتے ہیں۔ قرآن کریم کی سورۃ الحاقہ میں ہے کہ قیامت کے دن عرش الٰہی کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ (۱۹۴) اور سورۂ زمر میں ان فرشتوں کا ذکر ہے جو عرش الٰہی کے گرحافین (گھیرا ڈالنے والے) ہوں گے (۱۹۵) یہاں اردگرد گھومنے کی کوئی بات نہیں ہو رہی، نیز کسی چیز کو اٹھانے اور اس کے اردگرد گھومنے میں بہت فرق ہے۔ پرویز صاحب نے دو الگ الگ کاموں والے ملائکہ کو بہ ظاہر یک جا کر دیا ہے لیکن یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ جو ملائکہ عرش کو اٹھائے ہوئے ہوں وہ اس کے گرد گھوم کیسے سکتے ہیں؟

ملائکہ کے متعلق جو باہم مختلف و مغائر مفاہیم و معانی پرویز صاحب نے بیان فرمائے ہیں ان میں سے بعض کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے۔ ان عجیب و غریب معانی و مفاہیم سے پرویزی منکرین حدیث کے ملائکہ پر ایمان کی حقیقت بھی کھل گئی۔ ان منکرینِ حدیث کا فرشتوں پر وہ ایمان ہرگز ہرگز نہیں ہے جس کا مطالبہ اہل ایمان سے کیا گیا ہے۔

آسمانی کتابوں پر ایمان

سب سے سے آخری آسمانی کتاب قرآن کریم ہے۔ اسی قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کے مجمل احکام و مضامین کی تشریح و توضیح بھی ہمارے ذمہ ہے ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ (۱۹۶) اسی قرآن میں رسول اللہ ﷺ کو معلم کتاب و سنت ٹھہرایا گیا ہے۔ (۱۹۷) اسی قرآن میں آپ کو شارح قرآن بھی قرار دیا گیا ہے۔ (۱۹۸)

۱۹۳۔ ایضاً: ص ۱۴۷

۱۹۴۔ الحاقۃ: ۱۷

۱۹۵۔ الزمر: ۷۵

۱۹۶۔ القیامۃ: ۱۹

۱۹۷۔ البقرۃ: ۱۲۹۔۱۵۱، آل عمران: ۱۶۴، الجمعۃ: ۲

۱۹۸۔ النحل: ۴۴۔۶۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب بھی کوئی معلم کسی کتاب کی لوگوں کو تعلیم دے گا تو اس کی تشریح و تبیین کے لیے وہ اپنی طرف سے بھی بہت کچھ بتائے گا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کر تا کہ وہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہ بتائے اور صرف کتاب کے متن اور اس کی عبارتوں اور کلمات کو ہی دہراتا رہے۔ اسی قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ پیغمبر (دین کے بارے میں) اپنی خواہشِ نفس سے کوئی بات کہتا ہی نہیں بل کہ یہ سب کچھ اسے وحی کیا جاتا ہے۔[199] ان مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غیر تواراتی وحی بھی نازل ہوتی رہی اور یہ وحی بھی تورات کی طرح لوگوں پر حجت (واجب التسلیم) تھی ورنہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کو سمندر میں غرق نہ کیا جاتا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ پر بھی قرآنی وحی کے علاوہ غیر قرآنی وحی کا نزول بھی یقیناً ہوتا رہا۔ حضرت موسیٰ پر تورات کے علاوہ غیر توراتی وحی کے نزول کا بین ثبوت یہ ہے کہ تورات کے نزول سے بہت پہلے جب کوہ طور پر اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام کیا تو اپنے اس کلام کو وحی قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا: فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی[200] "تو جو (تیری طرف) وحی کیا جاتا ہے اسے خوب غور سے سُن"۔ یہ غیر توراتی وحی تھی جسے آپ فرعون کے پاس لے کر گئے تھے کیوں کہ آپ پر تورات کا نزول تو فرعون اور آل فرعون کے غرق ہونے کے بعد کہیں جا کر ہوا تھا۔

قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کسی بھی انسان سے اللہ کلام کرے تو اس کی تین صورتیں ہیں۔ وحی کے ذریعہ (کہ دل میں کوئی بات ڈال دی جائے یا خواب میں بتائی جائے اس یقین کے ساتھ کہ یہ اللہ ہی کی طرف سے ہے) پردے کے پیچھے سے کلام کرنا (جیسے حضرت موسیٰ سے کوہ طور پر اور رسول اللہ ﷺ سے معراج کے موقع پر ہوا) فرشتے کے ذریعے وحی بھیجنا (جیسے حضرت جبرئیلؑ اللہ کا کلام لے کر آتے رہے اور پیغمبروں تک پہنچاتے رہے)[201] اسی قرآن میں یہ مضمون بھی ہے کہ اس قرآن کو اللہ کے حکم سے فرشتہ جبریلؑ نے رسول ﷺ کے قلب مبارک پر اتارا ہے۔[202] پس وحی کی باقی ماندہ دو صورتیں اس غیر قرآنی وحی کی ہیں جو آپ کو اسی طرح دی گئی جیسے حضرت موسیٰ کو غیر توراتی وحی دی گئی۔ اسی قرآن میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فاصبر لحکم ربک

۱۹۹۔ النجم: ۳۔۴

۲۰۰۔ طٰہٰ: ۱۳

۲۰۱۔ الشوریٰ: ۵۱

۲۰۲۔ البقرۃ: ۹۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ولا تکن کصاحب الحوت (۲۰۳) "سو تو اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کر اور مچھلی (کا لقمہ بننے) والے (یونسؑ) کی طرح نہ ہو"۔ یعنی جیسے حضرت یونسؑ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اپنی بستی کو چھوڑ گئے تھے آپ ایسا نہ کریں، بل کہ اللہ کے حکم کے انتظار میں رہیں اور حکم حاصل کرنے کے بعد ہی وطن چھوڑیں۔ پس آپ نے مدینے کی جانب ہجرت فرمائی تو یہ اللہ کے حکم کے بغیر ہرگز نہیں تھی بل کہ وحی غیر قرآنی کی بنا پر تھی کیوں کہ قرآن میں تو ایسا کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ سفر کی حالت میں نماز میں قصر (کمی) کا حکم بھی قرآن میں موجود ہے۔ (۲۰۴) نماز میں کمی تب ہی ہو سکتی ہے جب کہ نمازوں کی رکعات کی تعداد معلوم اور متعیّن ہو، لیکن نمازوں کی رکعات کی تعداد کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے رکعات کا تعین غیر قرآنی وحی سے فرمایا۔ مشرکین مکہ کا ایک مطالبہ تھا کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آؤ یا اس کے مضامین کو ہماری خواہش اور مطالبے کے مطابق بدل ڈالو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ اَنْ اُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِيٓ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (۲۰۵) "(اے پیغمبر! تو کہہ دے مجھے یہ اختیار نہیں ہے کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل ڈالوں میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے بے شک اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔ کلام میں تحریف کی ایک واضح صورت یہ بھی ہے کہ متکلم کی مرضی کے بغیر اس کے کلام کے جملوں اور کلمات کو اپنی طرف سے مقدم و مؤخر کر دیا جائے۔ اس سے کسی کا اختلاف نہیں کہ قرآن کریم کی آیات کی موجود ترتیب قرآن کے نزول کے مطابق نزولی ترتیب نہیں بل کہ توقیفی ہے۔ حال آں کہ اس ترتیب کا قرآن میں کوئی حکم نہیں۔ پس آپ نے یہ ترتیب یقیناً غیر قرآنی وحی سے دلائی کیوں کہ اوپر آیت میں رسول اللہ ﷺ سے کہلایا جا چکا ہے کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے اور یہ کہ مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس قرآن کو بدل ڈالوں۔ آپ نے معاہدات و مکاتیب کے علاوہ اپنی کئی ایک احادیث بھی اپنے حکم سے لکھوائیں اور بہت سے صحابہ کرامؓ کو احادیث لکھنے کی اجازت بھی دی۔ ساتھ ہی قرآن کی کتابت کا آپ نے خاص اہتمام فرمایا حال آں کہ قرآن کریم کی کتابت یا عدم

۲۰۳۔ القلم: ۴۸

© rasailojaraid.com

۲۰۴۔ النساء: ۱۰۱

۲۰۵۔ یونس: ۱۵

© rasailojaraid.com

کتابت کا قرآن میں کوئی بھی حکم نہیں پس یہ کتابت بھی غیر قرآنی حکم سے ہوئی۔ الغرض رسول اللہ ﷺ پر قرآنی وحی کے نزول کے علاوہ غیر قرآنی وحی کے نزول پر بھی ایک دو نہیں بل کہ بہت سے یقینی، قطعی، محکم اور ناقابل تردید دلائل خود قرآن میں موجود ہیں اور ان تمام مضامین کو ہم انکار حدیث کے متعلق سابقہ مباحث میں تفصیل سے واضح کرتے چلے آئے ہیں۔ اور اسی قرآن میں بار بار رسول اللہ ﷺ کی غیر مشروط اطاعت کا حکم مسلمانوں کو دیا گیا ہے، لیکن منکرین حدیث اسی قرآن سے ثابت غیر قرآنی وحی کے یک سر منکر ہیں پس قرآن پر ان کے ایمان کے دعوے کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی۔ ان کا ایمان بالقرآن کا دعویٰ قطعاً جھوٹا اور سراسر فریب نفس ہے۔ قرآن کریم کے مجمل مضامین و احکام کی جو تشریح و توضیح اللہ تعالیٰ سے غیر قرآنی وحی پاکر خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے اقوال، افعال اور تقریرات یعنی اپنے اسوۂ حسنہ اور اپنی سنت مبارکہ سے امت کو پہنچائی اسے پرویزی منکرین حدیث نہیں مانتے لیکن جو من گھڑت تشریح و توضیح مسٹر غلام احمد پرویز نے اپنی کتابوں معارف القرآن مفہوم القرآن، مطالب القرآن وغیرہ وغیرہ میں کی ہے اسے دل و جان سے قبول کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا حکم (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) فرسودہ، بے کار، گزشتہ و رفتہ ہے لیکن سنت رسول کے مقابلے میں سنت پرویز بسرو چشم قبول ہے۔ ساء مایحکمون۔

نبیوں اور رسولوں پر ایمان

سب سے پہلے نبی اور نوع انسانی کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق پرویزی منکرینِ حدیث کا عقیدہ یہ ہے کہ آدم کسی فرد واحد کا نام نہیں بل کہ آدم و ابلیس کا واقعہ محض ایک تمثیل ہے، جس میں آدم کو محض نوعِ انسانی کا نمائندہ ظاہر کیا گیا ہے کیوں کہ بہ قول ان کے اگر اس قصے میں آدم کو نبی قرار دیا جائے تو ابلیس انہیں کبھی بھی پھسلا نہیں سکتا تھا۔ ان کا یہ خیال قطعاً باطل اور مردود ہے۔ قرآن کریم کو قرآن میں بارہا کتاب مبین، قرآن مبین یعنی کھلی اور واضح کتاب کہا گیا ہے۔ حضرت آدم و حوا اور ابلیس کا قصہ قرآن کریم میں متعدّد مقامات پر مذکور ہے۔ سیاق و سباق سے قطعاً کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ (معاذ اللہ) یہ صرف ڈرامہ رچایا جارہا ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے معصوم عن الخطاء ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عمداً کسی گناہ کے ہرگز مرتکب نہیں ہوتے۔ شیطان کے دھوکہ دینے سے وہ شاذ و نادر صورتوں میں کسی غلطی کا شکار ہوں یا کبھی کبھار اپنی سوچ بچار میں اعلیٰ کی بہ جائے ادنیٰ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صورت اختیار کریں تو ایسی غلطیوں اور ایسی خلافِ اولیٰ فکری کیفیتوں پر انہیں ہرگز برقرار نہیں رہنے دیا جاتا، بل کہ لازماً انہیں ان پر اطلاع اور ان کی اصلاح کر دی جاتی ہے، تاکہ دین کے متعلق ان کے اقوال وافعال کے صحیح ہونے پر لوگوں کا مکمل اعتماد قائم اور بحال رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب غیر ارادی طور پر ایک شخص ناحق مارا گیا تو انہیں اس پر از خود فوراً تنبیہ ہوئی۔ قرآن کریم میں ہے: قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۲۰۶) "(موسیٰ نے) کہا کہ یہ کام تو شیطان (کے بہکانے) سے ہوا ہے بے شک وہ (انسان کا) دشمن اور کھلے طور پر بہکانے والا ہے۔ (موسیٰ نے مزید) کہا کہ اے میرے رب! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا سو تو مجھے بخش دے تو (اللہ نے) اسے بخش دیا، بے شک وہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے"۔ اگر شیطان حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہکا سکتا تھا تو وہ حضرت آدم علیہ السلام کو کیوں دھوکہ نہیں دے سکتا تھا؟۔ چناں چہ قرآن کریم میں ہے: فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ (۲۰۷) "تو اس (شیطان نے) ان دونوں (آدم و حوا) کو دھوکہ دے کر (ممنوعہ درخت کا پھل کھانے کی طرف) کھینچ ہی لیا"۔ حضرت آدمؑ اپنی غلطی پر سخت پچھتائے اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق توبہ کی۔ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ (۲۰۸) "تو آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے تو (ان کلمات کے کہنے پر) اللہ نے اس پر رحمت سے توجہ فرمائی"۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں آدمؑ ایک فرد واحد کا نام ہے یہ کوئی تمثیلی کردار نہیں ہے، جیسا کہ مسٹر پرویز نے غیر مسلم ڈارون کے متنازعہ نظریۂ ارتقا کو وحی سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکہ دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ ہیں۔ ان پر ایمان لانے کا مفہوم مسٹر غلام احمد پرویز نے یوں بیان کیا ہے: "توحید کے بعد رسالت حضور ختم المرسلین پر ایمان لانا ضروری ہے، لیکن رسول پر ایمان سے مفہوم اس کی ذات پر ایمان نہیں، کیوں کہ اس کی ذات تو زمان و مکان کے حدود کی پابند ہوتی

۲۰۶۔ القصص: ۱۵۔۱۶

۲۰۷۔ الاعراف: ۲۲

۲۰۸۔ البقر[ۃ]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اور ملت اسلامیہ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے ابدیت سے ہم کنار ہے... رسالت محمدیہ پر ایمان سے مقصود اس کتاب پر ایمان ہے جو حضور ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی"۔ (۲۰۹)

مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے بعد پرویزی فکر کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی (معاذ اللہ) اب کوئی ضرورت باقی نہیں رہی)۔ اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد آپ کی ذاتِ مبارکہ (معاذ اللہ) معدوم ہوگئی۔ حال آں کہ کسی بھی رسول اور نبی کا وصفِ رسالت و نبوت عالم برزخ اور عالم آخرت میں (معاذ اللہ) زائل نہیں ہوجاتا۔ نیز رسول اللہ ﷺ اگر اس دار فانی سے رحلت فرما گئے تو آپ پر نازل ہونے والی وحی کتاب (قرآن کریم) اور وحی غیر کتاب جو آپ کے اقوال، افعال اور تقریرات یعنی سنت و حدیث کی صورت میں امت تک پہنچی ہے وہ آپ کے ساتھ ہی روضۂ مبارکہ میں مدفون نہیں ہوگئی۔ آپ کو قرآن او ربیان قرآن دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو لوگوں کے لیے حجت اور واجب التسلیم قرار دیا ہے، تو رسول اللہ ﷺ کی اس دار فانی سے دارِ بقاء کی جانب رحلت کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ خالق بھی (معاذ اللہ) فوت ہوچکا ہے۔ منکرین حدیث رسول اللہ ﷺ سے اس لیے بیزار اور آپ سے پیچھا چھڑانے کے درپے ہیں کہ قرآن کریم کو کھلونا بنانے کے لیے آپ کے بعد اپنے ہر دور کے مرکز ملت (حاکم اعلیٰ) کو آپ کے منصب رسالت پر زبان قال یا حال سے فائز کر سکیں۔ چناں چہ ادارہ طلوع اسلام کے رکن ڈاکٹر عبدالودود صاحب کہتے ہیں: "عملی انتظام کی سہولت کے لیے امت اپنے میں سے بہترین افراد کو اپنا نمائندہ بنا کر "فیکم رسول" (یعنی تمھارے اندر تمھارا رسول موجود ہے، ترجمہ از ناقل) کے سلسلے کو قائم رکھتی ہے اور یہ کہ رسول کی زندگی کے بعد فیکم رسول سے مراد ملت کی مرکزی اتھارٹی ہے، جو رسول کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ادا کرتی ہے اور یہ کہ رسول کے بعد صرف مرکز ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ دینی امور میں فیصلہ دے"۔ (۲۱۰)

متکلم اگر اپنے کلام کے مجملات و مشکلات کی تشریح خود کرے تو اس کا کلام مجمل نہیں بل کہ مفصل و مکمل سمجھا جائے گا، لیکن اگر اس کے مجمل کلام کی تشریح لوگ اپنے اپنے طور پر از خود یا اپنے حاکم اعلیٰ کے ذریعے کریں تو متکلّم کے کلام کو ہرگز مفصل و مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا، اور نہ ہی اس کے کلام کی دوسروں کے ذریعے تشریح و توضیح معتبر و مستند ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ پر قرآن

۲۰۹۔ غلام احمد پرویز۔ فردوس گم گشتہ، ص ۲۸۳

۲۱۰۔ طلوع اسلام [illegible] ۱۹۵۹ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نازل فرمایا تو ساتھ ہی یہ وعدہ بھی فرمایا: ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ [۲۱۱] "پھر اس کی وضاحت بھی ہمارے ذمے ہے"۔ یعنی قرآن کے ساتھ بیان قرآن بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر آخر الزمان کو عطا فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے ساتھ اس بیان قرآن کو بھی اپنے اقوال، افعال اور تقریرات یعنی اپنی سنت مبارکہ اور اپنے اسوۂ حسنہ سے لوگوں تک منتقل فرمایا۔ ادھر منکرین حدیث اس بیان قرآن کا حق اللہ اور اس کے رسول سے چھین کر اپنے مجوزہ "مرکز ملت" کے حوالے کرتے ہیں اور ساتھ ہی قرآن اور صاحب قرآن حضرت محمد ﷺ پر ایمان کا (جھوٹا اور فریب آمیز) دعویٰ بھی کرتے ہیں: قل بئسما یأمر کم بہ ایمانکم ان کنتم مومنین۔

جب ان منکرینِ حدیث سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم واقعی مومن ہو تو اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور آپ کی سنت مبارکہ کو حجت (واجب التسلیم) سمجھو، تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ قرآن ایک مفصل کتاب ہے، اس لیے ہمیں اس کو سمجھنے کے لیے حدیث کی ضرورت نہیں جو سنت رسول کی ترجمان ہے۔ لیکن جب وہ اپنے مرکز ملت کی بات کرتے ہیں تو یہی قرآن یکایک نامکمل ہو جاتا ہے۔ جس کے مجمل مضامین اور احکام کی تشریح ان کا مرکز ملت کیا کرے گا، یعنی رسول اللہ ﷺ کے شارع اور شارح قرآن ہونے کی حیثیت انہیں ہرگز قبول نہیں، بل کہ شارع اور شارح تو صرف اور صرف ان کا مجوزہ مرکز ملت ہی ہو سکتا ہے۔ چناں چہ مسٹر غلام احمد پرویز کے استاد حافظ محمد اسلم جیراج پوری لکھتے ہیں: "ہمارا ایمان ہے کہ قرآن تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اس کی ہدایت قیامت تک نافذ العمل رہے گی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے ضابطۂ حیات میں ہر قسم کے مسائل و معاملات کے لیے جزئی اور فرعی احکام نہیں دیے جا سکتے تھے"۔ [۲۱۲] چوں کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق ہر قسم کے معاملات کے لیے جزئی اور فرعی احکام یعنی قرآن کریم کے مجمل مضامین و احکام کی وضاحت اور قرآن پر زائد احکام کی تفصیل بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے قرآن کی طرح بیان قرآن کی صورت میں امت کو ملی ہے لہٰذا قرآن اپنے بیان قرآن کے ساتھ مفصل و مکمل ہے لیکن منکرینِ حدیث کے نزدیک قرآن نامکمل ہے، لہٰذا اس کی تکمیل ان کا ہر دور کا مرکز ملت کیا کرے گا۔

© rasailojaraid.com

۲۱۱۔ القیامۃ:۱۹

۲۱۲۔ مقام حدیث: ص ۲۴۲

© rasailojaraid.com

اوپر منکرِ حدیث ڈاکٹر عبدالودود کا یہ عقیدہ مذکور ہو چکا ہے کہ "رسول کے بعد صرف مرکزِ ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ دینی امور میں فیصلہ دے" اور یہ بھی مذکور ہو چکا ہے کہ ان کے نزدیک ہر مرکزِ ملت کی حیثیت فیکم رسول "تمھارے اندر مرکزِ ملت کی شکل وصورت میں اللہ کا رسول موجود ہے" کی ہوگی تو یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب منکرین حدیث کے فیکم رسول والی حیثیت کے "مرکزِ ملت" کا ظہور و صدور اور "قدوم میمنت لزوم" ہوا ہی نہیں اور نہ ہی مستقبل میں اس کا کوئی امکان نظر آتا ہے تو جناب غلام احمد پرویز نے "قرآنی فیصلے، معارف القرآن اور مطالب القرآن" جیسی اپنی کتابوں میں دینی امور کے متعلق بڑے بڑے فیصلے کیسے صادر فرمادیے؟ کیا پرویز صاحب نے ڈاکٹر عبدالودود والے فلسفے "فیکم رسول" کے تحت منصب رسالت تونہیں سنبھال رکھا تھا اور کیا وہ از خود "مرکزِ ملت" تونہیں بن گئے تھے؟ اس مشکل سوال کا آسان جواب منکرین حدیث کے اپنے ہی ادارہ طلوعِ اسلام کے ایک اور معزز رکن محمد علی خان بلوچ نے کچھ یوں دیا ہے۔ " غالباً ہماری طرح آپ حضرات میں سے بہت سوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اب سے کچھ عرصے پہلے اس وجہ اشتراک کے پردے میں کہ جس طرح رسول اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں نوعِ انسانی کو قرآن کریم کی دعوت دی تھی، آج کل اسی طرح گلبرگ لاہور کی کوٹھی نمبر ۲۵۔ بی میں جناب پرویز صاحب بھی قرآن کی دعوت دے رہے ہیں۔ جناب پرویز صاحب اپنے آپ کو آں حضرت ﷺ کے بلند مقام پر فائز کر کے ان تمام آیات کو جو آں حضرت کے متعلق ہیں اپنی ذات پر منطبق فرما لیتے ہیں۔ پھر جو آیات قرآنی مخالفین اسلام اور کفار سے متعلق نازل ہوئیں، انہیں نہایت چابک دستی سے اپنے مخالفین پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ حال آں کہ کجا حضور ختمی مرتبت علیہ السلام اور کہاں جناب پرویز۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ دونوں میں کوئی نسبت ہی پیدا نہیں کی جا سکتی۔"[۲۱۳] نہایت افسوس ہے کہ محمد علی خاں بلوچ جیسے لوگ اتنی موٹی سی بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی شارح قرآن اور شارع کی حیثیت کا انکار کیا جائے گا تو جو بھی بدبخت اور بدنصیب آپ کی جگہ شارح قرآن اور شارع (قانون ساز) بننے کی جسارت کرے گا، خواہ وہ منکرین حدیث کا نام نہاد "مرکزِ ملت" ہو یا کوئی اور شخص ہو، تو لازماً یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ کیا اس شارح اور شارع کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا ہے یا لوگوں نے اسے چنا ہے۔ اگر اللہ نے منتخب

۲۱۳۔ آئینہ پرویزیت ص ۱۸۔۱۲۸ [illegible] مصنف محمد علی خان بلوچ) مولانا عبدالرحمن کیلانیؒ مکتبہ السلام وسن پورہ گلی نمبر ۲۰۔ لاہور اکتوبر ۱۹۸ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرمایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی رسالت و نبوت کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر لوگوں نے چنا ہے تو کیا ایسا شارح اور شارع عیسائیوں کے پوپ کی طرح (نام نہاد) معصوم عن الخطاء ہو گا یا نہیں؟۔ اگر وہ پوپ کی طرح معصوم عن الخطا ہو گا تو منکرینِ حدیث کو ایسا اقرار کرنے میں شرمانا نہیں چاہیے بل کہ کھل کر اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ مسلمانوں میں نظام پاپائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ معصوم عن الخطا نہیں ہو گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں بل کہ لوگوں کی طرف سے منتخب ہو گا تو اسے فیکم رسول والی حیثیت کیسے حاصل ہو جائے گی؟ اگر منکرین حدیث ایسے کسی جھوٹے اور خود ساختہ شارح قرآن اور شارع کو زبان قال یا زبان حال سے رسول قرار دیتے ہیں تو ادارہ طلوع اسلام کے محمد علی خاں بلوچ جیسے معزز ارکان کو بھلا اعتراض کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا؟ فاعتبروا یاأولی الابصار۔

مذکورہ بالا مباحث سے اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور آسمانی کتابوں پر منکرین حدیث کے نمائشی ایمان کی حقیقت خوب واضح ہو جاتی ہے۔

آخرت پر ایمان

آخرت کے متعلق قرآنی مضامین میں مسٹر غلام احمد پرویز نے انتہائی شرم ناک تحریف کرتے ہوئے انہیں اپنے مفروضہ معاشی نظام ربوبیت (اشتراکیت) پر نہایت ہی بھونڈے انداز میں چسپاں کیا ہے، اور یوں عقیدۂ آخرت کا خوب مذاق اڑایا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا [۲۱۴] "اور آخرت (کی زندگی) درجوں میں اور بھی بڑھ کر ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے"۔ اس کا ترجمہ پرویز نے یوں کیا ہے "مستقبل کے درجات اور معاشی خوش حالیاں سب سے بڑھ کر ہیں"۔ [۲۱۵] مزید لکھا ہے "قرآن ان پیش یا افتادہ قریبی مفادِ عاملہ کو "دنیا" سے تعبیر کرتا ہے اور مستقبل کا نام "آخرت" رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کے نزدیک "متاع دنیا" سے مفہوم ہوتا ہے، وہ مفاد جو انسان صرف اپنی ذات کے لیے تلاش کرتا ہے، اور "سامانِ آخرت" سے مقصود ہوتا ہے وہ متاع جسے وہ آنے والی نسلوں کے لیے تیار کرتا ہے"۔ [۲۱۶] ایک اور مقام پر آخرت کا

۲۱۴۔ بنی اسرائیل:۲۱

۲۱۵۔ طلوع اسلام: فروری ۱۹۵۴ء، ص ۱۹،۲۰

۲۱۶۔ ایضاً: ص ۱۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفہوم یوں بیان کیا ہے "قرآن نے آخرت کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا معنیٰ ہے حال اور مستقبل کی خوش گواریاں"۔ (۲۱۷) سورۂ حجر میں ہے وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ "فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ (۲۱۸)" اور یقیناً قیامت آنے والی ہے پس تو (مخالفین و معاندین کے بارے میں) حسن و خوبی سے درگزر سے کام لے"۔ لیکن اس آیت کا پرویزی ترجمہ یہ ہے "جس انقلاب کے لیے تم جدوجہد کر رہے ہو وہ تو آکر رہے گا سو تم ان لوگوں سے نہایت عمدگی سے دامن بچا کر نکل جاؤ"۔ (۲۱۹) قیامت کے دن کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ مطففین میں فرمایا ہے "يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۲۰)" (یہ دن وہ ہوگا) جس دن لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے"۔ لیکن اس آیت کا پرویزی مفہوم یہ ہے "اس وقت تمام نوعِ انسانی (ذاتی مفاد کے پیچھے بھاگنے کی بہ جائے) خدا کی ربوبیت عامہ کے قیام کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی" (۲۲۱) قیامت کے دن اعمال تولے جانے کے متعلق سورہ انبیاء میں ہے " وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (۲۲۲)" اور قیامت کے دن ہم انصاف کی ترازو کھڑی کریں گے"۔ لیکن آیت کا پرویزی مفہوم یہ ہے "قرآن کہتا ہے کہ اب وہ دور (سرمایہ داری) گزر گیا ہے۔ اب وہ زمانہ (نظام ربوبیت کا) آرہا ہے جس میں انصاف کی رو سے میزان کھڑی کی جائے گی (وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ) اس میزان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی مزدور کی محنت میں کوئی کمی نہیں کر سکے گا اور محنت کرنے والے کی محنت کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوگا۔ اس کا حساب زمیں دار یا سرمایہ دار نہیں کیا کرے گا کہ محنت کش کا حصہ کیا ہے اور اس کا حصہ کتنا؟"۔ (۲۲۳) جنت کے متعلق پرویز نے لکھا ہے" ' پھر یہ بھی دیکھیے اس پروگرام (نظام ربوبیت) کے نتائج اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں (فسوف تعلمون) یہ نہیں کہا گیا کہ قیامت میں جا کر دیکھ لینا کہ کون جنت میں جاتا ہے اور کون جہنم میں۔ کہا یہ گیا ہے کہ ذرا توقف کرو۔ ہمارا پروگرام پورا ہو لینے دو تم ابھی دیکھ لوگے کہ جنت کس کے حصے

۲۱۷۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۹۰

۲۱۸۔ الحجر: ۸۵

۲۱۹۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۲۱۴

۲۲۰۔ المطففین: ٦

۲۲۱۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۲۳۱

۲۲۲۔ الانبیاء: ۴۷

۲۲۳۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۲۸۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں آتی ہے"۔ [۲۲۴] جہنم کے متعلق پرویز نے لکھا ہے "دیکھیے قرآن نے بتایا ہے کہ جہنم وہ مقام ہے جس میں زندگی کی نشوونما رک جاتی ہے (و لا یز کیھم) ان کے لیے مستقبل کی زندگی میں کوئی حصہ نہیں ہوگا (اولئک لا خلاق لھم فی الاٰخرۃ) جہنم کے لیے عربی کا لفظ جحیم آیا ہے۔ جحم کے معنٰی روک دینے کے ہیں یعنی اہل جہنم وہ ہیں جن کی نشوونما رک چکی ہو اور وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت نہ رکھیں، لٰہذا قرآن کی رو سے انسانی زندگی کا مقصود یہ ہے کہ انسانی ذات یا نفس (خودی یا انا) کی نشوونما (تزکیہ، تربیت) ہو جائے"۔ [۲۲۵] سورۂ انعام میں قیامت اور آخرت کے منکرین کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰہِ ؕ حَتّٰیٓ اِذَا جَآءَتْھُمُ السَّاعَۃُ بَغْتَۃً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْھَا ۙ وَھُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَھُمْ عَلٰی ظُھُوْرِھِمْ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ [۲۲۶]" بے شک وہ لوگ خسارے میں پڑے جنہوں نے اللہ سے ملاقات کو جھٹلایا یہاں تک کہ جب ان پر قیامت اچانک آ پہنچے گی تو وہ کہیں گے ہائے افسوس ہماری اس کوتاہی پر جو ہم نے اس (قیامت) کے بارے میں کی اور وہ اپنے (دنیوی گناہوں کے) بوجھ اپنے پیٹھوں پر لادے ہوں گے۔ خبردار! وہ بہت برے بوجھ ہوں گے جو انہوں نے لاد رکھے ہوں گے۔ اور دنیوی زندگی تو سوائے لہو و لعب کے کچھ بھی نہیں اور آخرت کا گھر ہی پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے سو کیا وہ سمجھتے نہیں؟"۔ مذکورہ بالا آیات کا ترجمہ و مفہوم پرویز نے یوں لکھا ہے "یہ جماعت جو سمجھے بیٹھی تھی کہ خدا کے قانون سے ان کا کبھی ٹکراؤ نہیں ہوگا تباہ ہو کر رہے گی۔ حتیٰ کہ جب انقلاب کی گھڑی دفعتاً نمودار ہو جائے گی تو وہ کفِ افسوس مل کر کہیں گے اس باب میں جو کچھ ہماری طرف سے ہوتا رہا اس پر ہمیں ندامت ہے لیکن ان کی یہ پشیمانی اس وقت ہوئی جب ان کے اعمال اپنا نتیجہ مرتب کر چکے تھے۔ ان کے اعمال کس قدر ناہمواریاں پیدا کرنے والے تھے۔ اس وقت وہ دیکھیں گے کہ قریبی مفاد پرستی کا نظریہ کس طرح بچوں کا کھیل اور سعی لاحاصل تھا۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنی جدوجہد کی خدا کے قانون ربوبیت کے ہم آہنگ رکھا تھا ان کے مستقبل کی زندگی کس قدر منفعت بخش ثابت ہوگی۔ اے کاش یہ لوگ اس حقیقت کو سمجھ لیتے" [۲۲۷]۔ سورۂ دھر میں ہے: اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِیْرًا ۝ اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُھَا

۲۲۴۔ ایضاً: ص ۲۱۸

۲۲۵۔ ایضاً ص ۶۷

۲۲۶۔ الانعام: ۳۱-۳۲

۲۲۷۔ قرآنی نظامِ ربوبیت ص ۲۴۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

كَافُوْرًا عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ○ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ○ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا"۔ (۲۲۸) "بے شک ہم نے کافروں کے لیے (آخرت میں) زنجیریں اور طوق اور دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ (اس کے برعکس) جو نیکوکار ہیں بے شک وہ ایسا مشروب پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔ یہ ایک چشمہ ہے جس میں سے اللہ کے (نیک) بندے پئیں گے اور اس میں چھوٹی چھوٹی نہریں نکالیں گے۔ یہ (نیک لوگ) وہ ہیں جو نذریں پوری کرتے ہیں اور (قیامت کے) اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی پھیل رہی ہوگی اور (وہ اس دنیا میں) اس کے باوجود کہ انہیں خود طعام کی خواہش اور حاجت ہے، فقیروں، مسکینوں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم تو تمہیں خالص اللہ کے لیے کھلاتے ہیں، ہم نہ تو تم سے کسی عوض کے خواست گار ہیں اور نہ ہی تم سے شکر گزاری کے طلب گار ہیں"۔ لیکن مسٹر غلام احمد پرویز نے مذکورہ بالا آیات کا ترجمہ اور مفہوم یوں بیان کیا ہے "اسے (انسان کو) یہ بھی بتلا دیا کہ اس (نظام ربوبیت) کے راستے سے روگردانی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی ذات کی صحیح آزادیاں سلب ہو جائیں گی، زندگی گھُٹ کر جوئے خم آب ہو جائے گی، اس کی کشادگیاں سمٹ جائیں گی، اس کی کھیتیاں جھلس جائیں گی (اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا)۔ اس راہ سے انکار کرنے والوں اور اس طرح زندگی کی برومندیوں کو دبا دینے والوں کے لیے زنجیریں اور طوق اور جھلسا دینے والی آگ کے شعلے بنا دیے گئے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اس راستے کو اختیار کریں گے ان کے سینے میں کشادگی اور نگاہوں میں وسعت پیدا ہوگی اور زندگی پھیل کر بحر بے کراں بن جائے گی، ان لوگوں کو ابرار کہہ کر پکارا گیا ہے، جس کے معنی کشادگی اور وسعت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ اس پیالے سے آب حیات پئیں گے جس میں سکون اور ٹھنڈک کی آمیزش ہوگی (اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا) یہ شراب آئے گی کہاں سے؟ اس چشمے سے جسے لوگ دل کی گہرائیوں سے پھاڑ کر نکالیں گے عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا اس چشمے کا منبع کہیں باہر سے نہیں ہوگا، اسے یہ لوگ خود اپنے عمق قلب سے نکال کر باہر لائیں گے۔ یہ نظام ایسا نہیں جسے ان پر استبداداً ٹھونس دیا جائے یہ دل کی دنیا سے ابھر کر باہر آئے گا۔ یہ ہوگا کیسے؟ اس طرح کہ یہ لوگ ان تمام واجبات کو جسے یہ خود اپنے اوپر عائد کریں گے نہایت عمدگی سے ادا کرتے جائیں گے (يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ) (نذر کے لفظ پر غور کیجیے، نذر کسی

© rasailojaraid.com

۲۲۸۔ الدھر: ۴۔۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرف سے عائد کردہ تاوان نہیں ہوتا خود اپنی مرضی سے مانی ہوئی منت ہوتی ہے) انہیں اس بات کا احساس ہوگا کہ اگر ہم نے اس قسم کا معاشرہ قائم نہ کیا تو اس کی جگہ ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا جس میں شر اس طرح عام ہو جائے گا کہ جو لوگ اس سے بچنا چاہیں گے وہ بھی نہ بچ سکیں گے۔ وہ اڑ اڑ کر از خود جا پہنچے گا (وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا) اس لیے وہ کریں گے کیا؟ ان تمام لوگوں کی روٹی کا انتظام کریں گے جن کی حرکت رک جائے، (مسکین) یا جو معاشرے کے اندر رہتے ہوئے اپنے آپ کو تنہا پائیں (یتیم) یا جن کی حرکت تو ہو لیکن وہ خارجی موانعات سے اس طرح گھر جائیں کہ ہل نہ سکیں (اسیر) اور یہ سب کچھ مفاد خویش کی کشش و جاذبیت کے علی الرغم کریں گے (وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا) اور اس کے لیے نہ کسی صلہ کی امید رکھیں گے نہ ستائش کی (إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا)، اس (یا وہ گوئی) کے بعد پرویز صاحب ارشاد فرماتے ہیں "یہ ہیں نظام ربوبیت کی بنیادیں۔ یعنی دل کی گہرائیوں سے وہ چشمے ابلیں جو مزرع انسانیت کی برومندی اور سرسبزی و شادابی کا موجب بنیں۔ قلب و نگاہ کی اس تبدیلی کا نام ہے مصلیؔ بننا"۔ (۲۲۹)

سورہ طٰہٰ میں قیامت کے مناظر کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا لَّا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا (۲۳۰) "اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں تو کہہ دے کہ میرا رب انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے اڑا دے گا تو (اس طرح) زمین کو بالکل ہموار اور صاف میدان کر کے چھوڑے گا جس میں نہ تو کہیں تو کوئی موڑ دیکھے گا اور نہ ہی کوئی اونچ نیچ"۔ اور سورہ کہف میں ہے: وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا۔ (۲۳۱) "اور جس دن (یعنی قیامت کے دن) ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تو زمین کو صاف کھلی ہوئی دیکھے گا اور ہم تمام لوگوں کو اکٹھا کریں گے ان میں سے ایک کو بھی باقی نہ چھوڑیں گے"۔ پرویز نے اس طرح کی آیات کو بھی قیامت اور مناظر قیامت سے الگ کر کے انہیں اپنے مفروضے نظام ربوبیت (اشتراکی نظام معیشت) پر نہایت ہی مکروہ اور بھونڈے انداز میں یوں چسپاں کر ڈالا "یہ فطرت کا اٹل فیصلہ ہے جسے واقع ہو کر رہنا ہے جو بڑی بڑی طاقتیں نظام ربوبیت کی راہ میں حائل ہوں گی انہیں اس طرح راستے سے ہٹا دیا جائے گا جس طرح تیز و تند ہوا بڑے بڑے تن آور

۲۲۹۔ قرآنی نظام ربوبیت، ص ۱۹۳۔۱۹۴

۲۳۰۔ طٰہٰ: ۱۰۵۔۱۰۷

۲۳۱۔ [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درختوں کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہے (وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ یَنْسِفُھَا رَبِّیْ نَسْفًا) اور اس کے بعد میدان صاف ہو جاتا ہے (فَیَذَرُھَا قَاعًا صَفْصَفًا) اس میں نہ کوئی ٹیڑھ پن باقی رہتا ہے نہ اونچ نیچ (وَلَا تَرٰی فِیْھَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا) ان سے اس طرح میدان صاف کر دینے کے بعد انسانیت کا وہ گروہ عظیم جو آج تک اسے بری طرح کچلا جا رہا ہے ابھر کر اوپر آ جائے گا (وَتَرَی الْاَرْضَ بَارِزَۃً)[۲۳۲]

عقیدۂ آخرت کے انکار کی راہ ہموار کرنے اور اس سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے غلام پرویز کا انتہائی مضحکہ خیز اور مکروہ ترین انداز یہ بھی ہے کہ قرآن کریم کے مختلف مقامات سے قرآنی آیات یا ان کے اجزاء کو ان کے اصل سیاق و سباق سے یک سر کاٹتے ہوئے اور انہیں اپنی طرف سے خود ساختہ مفہوم پہناتے ہوئے وہ ایک مربوط عبارت تیار کر کے اپنے قارئین کو خوب خوب دھوکہ دیتے ہیں۔

بہ طور نمونہ ہم جناب پرویز کی ایسی ایک عبارت پیش کرتے ہیں...اس کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ بھائی بھائی سے الگ ہو جاتا ہے (یوم یفر المرء من اخیہ) اولاد ماں باپ سے جدا ہو جاتی ہے (وامہ وابیہ) حتیٰ کہ میاں بیوی اور رباپ بیٹے کے مفاد تک بھی ایک دوسرے سے متصادم ہو جاتے ہیں (وصاحبتہ وبنیہ) ہر شخص اپنے اپنے مفاد کے حصول اور تحفظ میں ایسا جذب ہوتا ہے کہ اسے دنیا و مافیھا کی کچھ خبر نہیں رہتی (لکل امرئ منھم یومئذ شأن یغنیہ)۔ ان میں ہر شخص یہ ہی چاہتا ہے کہ وہ مشترکہ مفادِ انسانیت کی بہ جائے اپنے مفاد کے حصول کے لیے الگ الگ پروگرام بنائے (بل یرید کل امرئ منھم ان یؤتی صحفا منشرۃ) اس نظریے کے تحت جو کچھ افراد میں ہوتا ہے وہ ہی کچھ قوم میں ہوتا ہے۔ اس کی رو سے ہر قوم کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسری قوموں کو زندگی کی خوش گواریوں سے یوں محروم کر دے۔ (کلما دخلت امۃ لعنت اختھا) اس جہنمی [illegible] کی میں ہر قوم دوسری قوم کو محروم کرنے کی فکر میں ہوتی ہے (لعن کے معنٰی ہیں دور رکھنا، محروم کرنا) اور [illegible] طرح دوسری قوموں سے آگے بڑھ جائے (ان تکون امۃ ھی اربیٰ من امۃ) اس کے بعد جس طرح [illegible] دولت مند سمجھ لیتا ہے کہ مجھے اب دوسرے افراد انسانیہ کی پرواہ کیا ہے، میرا مال و دولت میرے لیے کافی ہے (کلا ان الانسان لیطغیٰ O ان رأہ استغنیٰ) جب انسان اپنے آپ کو مستغنی تصور کر لیتا ہے تو [illegible] آئین و ضوابط سے سرکشی اختیار کر لیتا ہے۔ غور کیجیے کتنی بڑی ہے یہ

۲۳۲۔ قرآنی نظام ربوبیت بص ۲۲۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقیقت جسے قرآن نے دو جملوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ ایسا انسان سمجھتا ہے کہ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا (ایحسب ان لن یقدر علیہ احد)"۔[۲۴۳]

پرویز نے مذکورہ اقتباس میں قرآن دشمنی کا واضح ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ ان کے اس طرح کے مضامین ان کی کتب میں جابجا ملتے ہیں۔ مذکورہ بالا اقتباس میں درج ذیل آیات سورۂ عبس کی ہیں اور ان کا تعلق قیامت کے دن سے یعنی اُخروی مناظر سے ہے: فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ"[۲۴۴] "پس جس دن بہرہ کر دینے والی (قیامت) آجائے گی، اس دن آدمی اپنے بھائی سے اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے دور بھاگے گا۔ ان میں سے ہر ایک کو اس دن ایسی فکر (دامن گیر) ہوگی جو اس کے لیے کافی ہوگی" ان آیات میں قیامت کا ذکر ہے جسے بہرہ کر دینے والی اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ ایک نہایت سخت چیخ (صور اسرافیل) سے واقع ہوگی۔ اس دن ہر شخص کو اپنی ہی فکر دامن گیر ہوگی وہ کسی اور کے متعلق فکر تو کیا بلکہ اپنے قریب ترین رشتہ داروں بھائی، ماں، باپ، بیوی اور بچوں سے بھی دور بھاگے گا۔

پرویز کے مذکورہ اقتباس میں یہ آیت سورۂ مدثر کی ہے: بَلْ یُرِیْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ یُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً"[۲۴۵] "بل کہ ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ اسے کھلی ہوئی کتابیں دی جائیں"۔ یعنی ہر ایک کے ہاتھ میں اللہ کی طرف سے نازل کردہ ایک ایک کتاب ہو جس میں لکھا ہو کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں یا اگر محمد (ﷺ) کو واقعی اللہ کی طرف سے کتاب ملی ہے، تو ہمیں بھی ایک ایک کتاب کیوں نہیں دی جاتی؟۔ مذکورہ پرویزی عبارت میں سورۂ اعراف کی ایک آیت کا بھی ٹکڑا دیا گیا ہے۔ پوری آیت یوں ہے: قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِی النَّارِ ط كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ط حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا لا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ط قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ"۔[۲۴۶] "(اللہ تعالیٰ) فرمائے گا کہ جو جماعتیں تم سے پہلے گزر چکی ہیں جنات میں سے بھی

۲۴۳۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۹۲۔۹۳

۲۴۴۔ عبس: ۳۳۔۳۷

۲۴۵۔ المدثر: ۵۲

۲۴۶۔ الاعراف: ۳۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور آدمیوں میں سے بھی، ان کے ساتھ تم بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔ جس وقت بھی کوئی جماعت (جہنم میں) داخل ہوگی اپنی دوسری جماعت کو لعنت کرے گی۔ یہاں تک کہ جب سب اس میں جمع ہو جائیں گے تو پچھلے لوگ پہلے لوگوں کے بارے میں کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ان ہی لوگوں نے گم راہ کیا تھا سو توانہیں آگ میں دوگنا عذاب دے۔ اللہ فرمائے گا کہ سب ہی کے لیے دگنا عذاب ہے لیکن تمہیں خبر نہیں"۔ اس آیت کا تعلق بھی اُخروی مناظر جہنم سے ہے۔

مذکورہ پرویزی اقتباس میں سورۂ نحل کی ایک آیت کا بھی ٹکڑا دیا گیا ہے۔ پوری آیت مع صحیح ترجمہ و مفہوم یوں ہے: "وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا ط تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا م بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ" هِيَ أَرْبَى مِنْ أُمَّةٍ ط إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ ط وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ "[۲۳۷] "اور تم اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت مضبوط کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر کے توڑ ڈالا کہ تم اپنی قسموں کو آپس کے مکر کا باعث ٹھہرا، اس لیے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھا چڑھا ہو جائے۔ بات صرف یہ ہے کہ اس عہد سے اللہ تمھاری آزمائش کرتا ہے۔ بے شک اللہ قیامت کے دن ہر اس چیز کو ضرور بالضرور کھول کر بیان کرے گا جس میں تم اختلاف کر رہے ہو"۔ یعنی جس عہد کو قسم اٹھا کر پختہ کیا گیا ہو اسے توڑ ڈالنا ایسا ہی ہے، جیسے کوئی عورت سوت کاتنے کے بعد خود ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ اس لیے تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو فریب اور دھوکہ دینے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ مثلاً تم جب دیکھ لو اب تم زیادہ ہو گئے ہو تو اسکم زور فریق کو نقصان پہنچانے پر اتر آؤ جو تم سے معاہدہ کر کے بے خوف ہو گیا تھا۔ دورِ جاہلیت میں اس طرح کی عہد شکنی عام تھی۔ مسلمانوں کو اس اخلاقی پستی سے روکا گیا ہے۔

مذکورہ پرویزی اقتباس میں سورۂ بلد کی ایک آیت بھی دی گئی ہے: أَيَحْسَبُ أَنْ لَنْ يَقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ "[۲۳۸] "کیا وہ یہ گمان کرتا ہے کہ وہ کسی کے بس میں ہی نہیں؟"۔ اس سے پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے انسان کو (بڑی) مشقت میں پیدا کیا ہے یعنی اس کی زندگی محنت و مشقت اور تکالیف سے بھری پڑی ہے، لیکن اس کے باوجود کیا وہ یہ گمان کر بیٹھا ہے کہ وہ کسی کی گرفت میں ہی نہیں ہے؟

۲۳۷۔ النحل: ۹۲
۲۳۸۔ البلد: ۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر سلیم الطبع شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو بھی قرآن پر ایمان کا (جھوٹا) دعویٰ کرتے ہوئے اسے بدترین معنوی تحریف کا نشانہ اور بچوں کا کھلونا بناتا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ مجرم ہے جو اس کتاب کا کھلم کھلا انکار کرتا ہے۔ مسٹر پرویز کا یہ انتہائی مکروہ کھیل اس حقیقت کی بھرپور غمازی کرتا ہے کہ پرویزی منکرین حدیث کا قرآن کریم اور اسلامی عقائد و ارکان پر ایمان کا دعویٰ قطعاً جھوٹا اور سراسر منافقت اور فریب پر مبنی ہے۔

تقدیر پر ایمان

عقیدۂ تقدیر کے متعلق غلام احمد پرویز کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں یہ عقیدہ مجوسیوں سے آیا ہے چناں چہ وہ لکھتے ہیں: ''اس طرح جب ایک دفعہ فرقہ بندی ہوگئی تو پھر اس کے بعد چل سو چل۔ مجوسی اساورہ نے یہ سب کچھ اس خاموشی سے کیا کہ کوئی بھانپ ہی نہ سکا کہ اسلام کی گاڑی کس طرح دوسری پٹڑی پر جا پڑی۔ انہوں نے تقدیر کے مسئلے کو اتنی اہمیت دی کہ اسے مسلمانوں کا جزو ایمان بنا دیا۔ چناں چہ ہمارے ایمان میں و القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ کا چھٹا جزو ان ہی کا داخل کیا ہوا ہے''۔ (۲۳۹)

عقیدۂ تقدیر کے متعلق بھی قرآنی مضامین کو مسٹر پرویز نے نہایت ہی شرم ناک، مکروہ اور بھونڈے انداز سے اپنے خود ساختہ نظام ربوبیت (اشتراکی نظام معیشت) پر چسپاں کر ڈالا ہے۔ مثلاً سورۂ حدید میں ہے: مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ط اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ ''لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ط وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ'' (۲۴۰) نہ کوئی مصیبت ملک پر آتی ہے اور نہ ہی تمھاری جانوں پر پڑتی ہے مگر اس سے پہلے کہ ہم اُن (مصیبت) کو پیدا کریں وہ ایک کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی ہے۔ بے شک یہ کام اللہ پر آسان ہے، تاکہ جو (مطلب) تم سے فوت ہوگیا اس کا تم غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو اس نے دیا ہے اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ کسی اترانے والے اور شیخی بگھارنے والے کو پسند نہیں کرتا''۔ ان آیات میں قضا و قدر کے متعلق بتایا گیا ہے کہ کسی مقصد و مطلب کے حاصل نہ ہونے پر جزع فزع اور بے صبری کا اظہار کرنے کی بہ جائے رضا بالقضا سے کام لیتے ہوئے صبر کیا کرو اور اگر اپنے مطلب و مقصد کی کوئی چیز تمہیں اللہ تعالیٰ عطا فرمائے تو اس پر شیخی بگھارنے اور فخر و غرور میں مبتلا ہونے کی بہ جائے اللہ کا

۲۳۹۔ پرویز۔ قرآنی فیصلے: ص ۱۹۰

۲۴۰۔ الحدید: ۲۲۔ ۲۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شکر کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے صبر و شکر پر راضی ہوتا ہے اور جو اترانے والا اور شیخی بگھارنے والا ہو اسے وہ پسند نہیں کرتا۔ الغرض جو کچھ بھی نیک و بد تمھارے ساتھ ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے پیشگی علم کے عین مطابق ہے جسے اس نے لوح محفوظ میں درج کر رکھا ہے ایسا کرنا اللہ کے لیے آسان ہے۔ لیکن مسٹر پرویز نے ان آیات کو اپنے مفروضہ نظام ربوبیت (اشتراکی نظام معیشت) پر ناحق چسپاں کرتے ہوئے ان کا معنیٰ و مفہوم یوں لکھا ہے: اس نظام میں اس قسم کے (اتفاقی) حوادث کے لیے پہلے ہی گنجائش رکھ دی گئی ہے (مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا وَ لَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ) ۔ اس نظام میں اس قسم کے خارجی یا داخلی حوادث کے لیے ذخیرہ کر لینا کچھ دشوار نہیں (اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ) یہ وہ نظام ہے جس میں کسی استعداد کے کم یا سلب ہو جانے سے انسان سامان نشو و نما سے محروم نہیں رہ جاتا (لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ) اس لیے کہ جن کی استعداد زیادہ ہوتی ہے وہ اس استعداد کے ماحصل کو اپنی ملکیت نہیں سمجھ لیتے (وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ) یہ دشواری اس معاشرے میں پیش آتی ہے جہاں ہر شخص خود بڑا بننے کی فکر کرے اور اس کے لیے دوسرے انسانوں کی کمائی پر اس طرح چپکے چپکے ہاتھ مارے جس طرح شکاری دبے پاؤں شکار کو جا دبوچتا ہے (وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ)[۲۴۱]

پانچواں حصہ: ارکان اسلام اور پرویزی منکرینِ حدیث

اسلام کی پرویزی تعریف

پرویز نے لکھا ہے "اسلام کا معنیٰ ہے اس نظام کا قیام جس میں ہر شے کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جائے یعنی نظام ربوبیت کی تکمیل"۔ [۲۴۲] اسلام کی اس تعریف کی رو سے کفر کا مفہوم بھی پرویزی لغت میں بدل گیا۔ پرویز کے نزدیک کافر وہ ہے جو ان کے مجوزہ نظام ربوبیت کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ سورۂ کہف میں اخروی حساب کتاب اور میزان اعمال کے سلسلے میں کفار کے بارے میں ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا[۲۴۳]

۲۴۱۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۵۷

۲۴۲۔ ایضاً: ص ۱۴

۲۴۳۔ الکہف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"وہ یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں اور اس کی ملاقات سے کفر کیا پس قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قائم نہ کریں گے"۔

لیکن پرویز نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے: "یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے قانون ربوبیت سے انکار کرتے ہیں اور حقائق کا سامنا کرنے سے جی چراتے ہیں سو ان کے پروگرام بہ ظاہر بڑے خوش آئند نظر آتے ہیں، لیکن ان کے ٹھوس نتائج کبھی بھی مرتب نہیں ہو سکتے۔ قیام انسانیت کے پروگرام میں ان کے اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا"۔ (۲۴۴) اسلام اور کفر کی جب تعریف ہی نئی ہو گئی تو ارکان اسلام بھلا کیسے پرویزی تصرف اور اکھاڑ پچھاڑ سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ اسلام کا اولین رکن ہے کہ زبان سے یہ گواہی دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ واحد اور لاشریک ہے اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ لیکن مسٹر غلام احمد پرویز کے نزدیک توحید کی تعریف یہ ہے "وہ انقلاب جس میں معاشی نظام انسانیت بھی اس خدا کے ہاتھ میں (یعنی اس کے قانون کے مطابق قائم) ہوگا جس کے ہاتھ میں کائناتی نظام ہے (والارض جمیعا قبضته یوم القیامة والسموات مطویات بیمینه) اسی کے معنی توحید ہیں"(۲۴۵) توحید کا ایک اور پرویزی مفہوم یہ ہے "چوں کہ انسان صفاتِ خداوندی (روح خداوندی) کا حامل ہے اس لیے اس کی تکمیل آدمیت کے لیے نمونہ صرف خدا کی صفات ہو سکتی ہیں اور صفات خداوندی ہر فرد انسانیت کے لیے نمونہ ہوں گی۔ تمام نبی نوع انسان کے لیے ایک ہی نمونہ (pattern) ہوں گی کیوں کہ ہر انسان ان ہی صفات کا حامل ہے اسے "توحید" کہتے ہیں یعنی زندگی کے لیے صرف ایک نمونہ اور ایک نصب العین ہونا (لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ)" (۲۴۶)۔ توحید کی مذکورہ بالا دونوں تعریفوں کے باہم تعلق کو سمجھ پانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ زیادہ غور و خوض سے کام لیا جائے تو مذکورہ تعریف میں لفظ "نصب العین" سے کام بنتا دکھائی دیتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

قولوا آمنا باللہ وما اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ
يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ
رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۲۴۷)

۲۴۴۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۹۷

۲۴۵۔ ایضاً: ص ۲۸۵

۲۴۶۔ سلیم کے نام ۲۰واں خط: ص ۳۵۶

۲۴۷۔ البقرہ۔ ۱۳۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"(اے مسلمانو!) تم کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس وحی پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو وحی ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور جو وحی موسیٰ اور عیسیٰ اور (دوسرے) نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی سب پر ہم ایمان لائے اور ہم ان (پیغمبروں) میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان لائیں اور کسی پر ایمان نہ لائیں) اور ہم سب اسی (اللہ) کے فرماں بردار ہیں"۔

لیکن اس آیت کا پرویزی ترجمہ اور مفہوم یہ ہے " ان سے کہہ دو کہ ہم اس نظام کو اپنا نصب العین بناتے ہیں جو ہماری ربوبیت کے ضامن (خدا) کی طرف سے ہمیں ملا ہے، اور جو اس سے پہلے ابراہیم اسماعیل اسحاق اور ان کی اولاد پر نازل کیا گیا تھا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کی وساطت سے انسانوں کو ملا (یہ ایک ہی نظام تھا جو شروع سے آخر تک انسانوں کو ملتا رہا)، اس لیے ہم اس نظام کے لانے والوں میں باہم دیگر کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہم اسی نظام کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں"۔ [۲۴۸]

اس پرویزی ترجمے سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب نظام ربوبیت (اشتراکی نظام معیشت) کو اپنا نصب العین بنانا اور اس پر ایمان لانا ہے " اللہ " کا معنی "نظام ربوبیت" ہے۔ یہی نظام ربوبیت حضرت ابراہیمؑ سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک تمام انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتا رہا ہے۔ "رب" کا پرویزی معنیٰ بھی "خدا کی ربوبیت" بہ الفاظ دیگر "نظام ربوبیت" ہے مثلاً سورہ مطففین میں ہے: يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِينَ [۲۴۹] "جس دن یعنی بہ روز قیامت لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے " لیکن آیت کا پرویزی ترجمہ یہ ہے "تمام نوع انسانی خدا کی ربوبیت کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی"۔ [۲۵۰] "قرآن" کا پرویزی معنیٰ بھی "قانون ربوبیت" ہے۔ مثلاً سورہ بروج میں ہے: بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِىْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ [۲۵۱] "بل کہ وہ قرآن ہے بڑی شان والا، لوح محفوظ میں لکھا ہوا"۔ مگر اس آیت کا پرویزی ترجمہ یہ ہے "وہ قانون ایسے محفوظ مقام میں رکھا گیا ہے جہاں زمانے کے اثرات نہیں پہنچ سکتے"۔ [۲۵۲] "دین کا پرویزی معنیٰ بھی "نظام ربوبیت" ہے۔ چناں

۲۴۸۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۹

۲۴۹۔ المطففین: ۶

۲۵۰۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۲۵۸

۲۵۱۔ البروج: ۲۱۔۲۲

۲۵۲۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۲۱۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چہ پرویز صاحب لکھتے ہیں "قرآن نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ الدین سے مفہوم نظام ربوبیت کا قیام ہے"۔[۲۵۳] "بینہ" کا پرویزی معنیٰ بھی "قانون ربوبیت" ہے۔ مثلاً سورہ اعراف میں ہے قَدْ جَآءَ تْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ[۲۵۴] "بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے واضح دلیل آچکی ہے"لیکن اس کا پرویزی ترجمہ یہ ہے "تمھارے پاس خدا کا قانونِ ربوبیت نہایت واضح انداز میں آچکا ہے"۔[۲۵۵] لفظ "آیات" کا پرویزی معنیٰ بھی "قانون ربوبیت" ہے مثلاً سورہ کہف میں ہے: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ[۲۵۶] "یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیتوں سے کفر کیا"۔ لیکن اس کا پرویزی ترجمہ یہ ہے "یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے قانون ربوبیت سے انکار کرتے ہیں"[۲۵۷] اسلام کا معنیٰ بھی "نظام ربوبیت کا قیام" ہے جیسا کہ پہلے اوپر بیان ہو چکا ہے۔ "توحید" کا معنیٰ بھی اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ معاشی نظام انسانیت والے انقلاب (یعنی نظام ربوبیت) ہی کو توحید کہا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ یہی حال منکرین حدیث کے امام مسٹر غلام احمد پرویز کا ہے کہ انہیں ہر طرف اشتراکی نظام معیشت ہی نظر آتا ہے جسے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے انہوں نے "قرآنی نظام ربوبیت" کا نام دے رکھا ہے۔ چناں چہ ان کا دعویٰ ہے کہ افراد کی نجی املاک کی نفی اور تمام ذرائع پیداوار ریاست کی تحویل میں دینے کے عمل کو اگر اشتراکیت کا نام دیا جائے تو ایسے اشتراکی نظام معیشت کے لیے لوگوں میں کوئی جذبۂ محرکہ پیدا نہیں ہوتا، لیکن اگر اسے "قرآنی نظام ربوبیت" کا نام دیا جائے تو موزوں رہتا ہے بل کہ بہ قول پرویز قرآن کا نزول اسی نظام کے قیام کے لیے ہی ہوا تھا اور یہ نظام تمام انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتا رہا ہے۔ پس اگر اسلام کے پہلے رکن اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد ﷺ کی رسالت کی شہادت کا صحیح تصور اس نام نہاد "قرآنی نظام ربوبیت" کے اندر ہی کہیں گم سُم ہو کر رہ جائے تو لوگوں کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن یہاں زبردست سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ نظام ربوبیت رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا تھا؟ اس مشکل سوال کا جواب پرویز کے لیے آسان نہیں تھا اس لیے گلو خلاصی کے لیے اپنی عجمی ٹکسال میں انہیں یوں جھوٹی روایت گھڑنی پڑی۔ " آج دنیا

۲۵۳۔ ایضاً: ص ۱۱۵

۲۵۴۔ الاعراف: ۸۵

۲۵۵۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۹۴

۲۵۶۔ الکہف: ۱۰۵

۲۵۷۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۹۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حیران ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہ کی قلیل جماعت نے اتنے مختصر سے عرصے میں ایسی محیر العقول ترقی کس طرح کر لی تھی۔ دنیا حیران ہے اور اس کے لیے تحقیقاتی ادارے قائم کرتی ہے، لیکن اسے معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے وہ معاشرہ متشکل کر لیا تھا جو قرآنی نظام ربوبیت کا حامل تھا، یہ تمام محیر العقول ترقیاں اسی کے ثمرات تھیں"۔ (۲۵۸) یہاں مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ نے واقعی پرویزی ذہن کا "نظام ربوبیت" قائم فرمایا تھا تو اس کی خبر تو آئندہ نسلوں تک تواتر و تسلسل سے پہنچنی چاہیے تھی۔ اس مشکل سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے مسٹر پرویز کو اپنے سابقہ (جھوٹے) بیان سے قدرے پیچھے ہٹنے پر بادل ناخواستہ مجبور ہونا پڑا۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں: "آپ نے ایک چیز کو نمایاں طور پر محسوس کیا ہوگا اور یہ کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی سند میں صرف قرآن کی آیات پیش کی ہیں۔ تاریخ اور روایات سے کچھ نہیں لکھا حتیٰ کہ میں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ نبی اکرم ﷺ نے جس نظام ربوبیت کو متشکل فرمایا اس کے خد و خال کیا تھے؟ اور وہ کب تک علیٰ حالہٖ قائم رہا۔ ایک بات بالکل واضح ہے کہ جو کچھ ان صفحات میں لکھا گیا ہے وہ قرآن کی رو سے صحیح ہے، تو اس کے بعد ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی اکرم نے اسی کے مطابق معاشرے کی تشکیل فرمائی ہوگی"۔ (۲۵۹) پرویز صاحب اب سب کو یوں مطمئن کرنے کی سعی لاحاصل فرما رہے ہیں کہ اگر آپ کو یقین نہیں آتا کہ رسول اللہ ﷺ نے (پرویزی ذہن کا) قرآنی نظام ربوبیت واقعی قائم فرمایا تھا تو چلیے یوں سمجھ لیجئے کہ ضرور قائم فرمایا ہوگا کیوں کہ قرآنی آیات کی جو (خود ساختہ اور جھوٹی، از ناقل) تفسیر میں نے بیان کی ہے اگر یہ صحیح ہے، تو یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے یہ نظام متشکل نہیں فرمایا ہوگا، اس پر مزید سوال پیدا ہوا کہ "ضرور متشکل فرمایا ہوگا" کے لیے بھی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ تاریخی ثبوت تو سامنے لایا جائے۔ چوں کہ ایک جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے سو جھوٹ اور بولنے پڑتے ہیں۔ لہٰذا جناب پرویز نے اس مشکل سوال کے جواب میں پینترا بدلتے ہوئے نیا انکشاف یہ فرمایا "لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جس زمانہ (چھٹی صدی عیسوی) میں قرآن نازل ہوا ہے ذہن انسانی اپنی پختگی تک نہیں پہنچ چکا تھا۔ اس نے فقط اپنے عہد طفولیت کو چھوڑا تھا، اب اسے رفتہ رفتہ پختگی تک پہنچنا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی فقید المثال تعلیم اور سیرت سے قرآنی اصولوں کو معاشرہ میں نافذ العمل کر کے دکھا دیا تھا کہ معلوم ہو جائے کہ یہ اصول ناممکن نہیں۔ لیکن اس زمانہ کی دنیا ہنوز ذہنی طور پر اس سطح پر نہیں آ چکی تھی

© rasailojaraid.com

۲۵۸۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۸۰

۲۵۹۔ [illegible] ۲۲۳۔ ۲۲۴

© rasailojaraid.com

کہ وہ ان اصولوں کو یا ان کی بنیادوں پر قائم معاشرہ کو شعوری طور پر اپنا سکے۔ یہ چیزیں ابھی ان کے شعور میں سما ہی نہیں سکتی تھیں۔ اگر مسلمان اسے اسی "ایمان بالغیب" کے انداز سے جس سے یہ معاشرہ قائم ہوا تھا آگے چلاتے رہتے تو یہ آگے بڑھتا رہتا، لیکن انہوں نے اس طریق کو چھوڑ دیا اور شعوری طور پر دنیا ہنوز اس قابل نہ تھی کہ اسے اختیار کر سکتی لہٰذا یہ نظام ختم ہو گیا"۔ (۲۶۰)

یہاں پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ نزول قرآن کا زمانہ چھٹی صدی عیسوی کا نہیں جیسا کہ اپنے آپ کو اونچے درجے کا حکیم اور دانش ور سمجھنے والے اور علمائے ربانیین کو اپنی تحریروں میں جا بہ جا "جاہل ملا" قرار دینے والے غلام احمد پرویز نے بیان کیا ہے بل کہ ساتویں صدی عیسوی کا ہے تاہم مذکورہ بالا پرویزی عبارت سے مزید چند در چند الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ یہاں درج ذیل امور توجہ طلب ہیں:

الف: رسول اللہ ﷺ کے دور کا انسانی ذہن اگر اتنی پختگی تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ وہ (پرویزی) نظام ربوبیت کی باریکیوں کو سمجھ پاتا تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اپنا رسول وقت سے بہت پہلے بھیج دیا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ انسانی ذہن کے پختگی تک پہنچنے کا بہ الفاظ دیگر پرویز صاحب کے زمانے کا انتظار فرما لیتا۔ یہ بات پرویزی منکرین حدیث کو ہی معلوم ہو گی کہ آخر اللہ تعالیٰ کو اتنی جلدی بھی کیا پڑی تھی کہ اپنے پیغمبر کو سیکڑوں برس پہلے بھیج دیا؟

ب: بہ قول پرویز رسول اللہ ﷺ کے دور کا انسانی ذہن گو پختگی تک تو نہیں پہنچا تھا لیکن عہد طفولیت سے بہ ہر حال باہر آ چکا تھا۔ ساتھ ہی پرویز صاحب کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ یہ قرآنی نظام ربوبیت ایسا نصب العین ہے جو گذشتہ انبیاء علیہم السلام پر بھی نازل ہوتا رہا ہے۔ زمنی ترتیب کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے دور کا انسانی ذہن تازہ تازہ عہد طفولیت سے باہر آیا تھا تو امم ماضیہ کا دور یقیناً عہد طفولیت کی منازل میں ہونا چاہیے۔ اب اگر امم ماضیہ عہد طفولیت میں ہی اس "نظام ربوبیت" کو سمجھ پائی تھیں تو رسول اللہ ﷺ کے دور کا ذہن تو عہد طفولیت سے نکل چکا تھا تو آپ کے دور کا انسانی ذہن (پرویز کے بیان کردہ) "قرآنی نظام ربوبیت" کے مضمرات کو سمجھنے سے کیوں قاصر رہا؟ اس (مفروضہ) صورت حال کے پیش نظر امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو خیر الامم کہنا کیسے درست ہوا؟

© rasailojaraid.com

۲۶۰۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۲۳۴

© rasailojaraid.com

ج: اور اگر امم ماضیہ جن کا انسانی ذہن ابھی عہد طفولیت میں تھا اس نظام ربوبیت کو سمجھنے سے قاصر رہا تھا (اور عقل سلیم کا فیصلہ بھی یہی ہونا چاہیے کہ جب خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کے دور کا انسانی ذہن عہد طفولیت سے باہر نکل آنے کے باوجود مبینہ قرآنی نظام ربوبیت کو کماحقہ سمجھنے کی صلاحیت سے محروم تھا تو بھلا امم ماضیہ کا عہد طفولیت والا ذہن اسے کیسے سمجھ سکتا تھا؟) تو اس کا مطلب یہی تو ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے گذشتہ انبیا علیہم السلام کو نظام ربوبیت کے قیام کا ایسا نصب العین دے کر بھیجا تھا جسے ان کی امتیں سمجھنے سے سراسر قاصر تھیں۔ یعنی پرویزی فکر کے لازمی نتائج کے مطابق ان لاتعداد انبیاء علیہم السلام کی اور خود رسول اللہ ﷺ کی بعثت بھی (معاذاللہ ثم معاذاللہ) محض فعل عبث تھی۔

د: پرویزی سوچ کے مطابق چوں کہ پرویز کے زمانے تک انسانی ذہن کو پختگی حاصل ہو چکی تھی لہٰذا اللہ تعالیٰ سے مناسب وقت کا انتظار کیے بغیر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین محمد ﷺ تک نبیوں اور رسولوں کو بھیجنے کی (معاذاللہ ثم معاذاللہ) جو غلطی ہوتی رہی اس کی تلافی کی بہترین صورت یہ تھی کہ اور نہیں تو آخری نبی کو ہی پرویز صاحب کے زمانے میں مبعوث کیا جاتا، بل کہ بہتر تو یہی ہوتا کہ خود جناب پرویز صاحب کو ہی منصب نبوت پر فائز کر دیا جاتا، کیوں کہ پرویز صاحب لکھتے ہیں "جہاں تک میرا مطالعہ رہ نمائی کرتا ہے قرنِ اول کے بعد (کہ جس میں یہ نظام اس زمانے کے حالات کے مطابق اپنی عملی شکل میں قائم ہوا تھا) اسلام کی تاریخ میں میری یہ پہلی کوشش ہے کہ اس نظام کو سامنے لایا گیا ہے"۔ (۲۶۱) جناب پرویز صاحب کی تضاد بیانیوں اور دل چسپ کہہ مکرنیوں پر غور فرمائیے کبھی تو وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ نظام ربوبیت قرن اول میں قائم ہو گیا تھا اور دنیا عالم حیرت و استعجاب میں اس کے متعلق تحقیقی ادارے قائم کر رہی ہے۔ کبھی فرماتے ہیں کہ ضرور قائم ہوا ہوگا اور کبھی ان پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ دولہ اگرچہ عہد طفولیت سے باہر آ چکا تھا، لیکن پختگی تک نہ پہنچ پانے کی وجہ سے اس نظام ربوبیت کو کماحقہ سمجھ پانے اور اسے برقرار رکھنے کی صلاحیت سے محروم تھا اور اب پھر فرماتے ہیں کہ یہ نظام قرن اول میں اپنے حالات کے مطابق قائم ہوا تھا اس کے بعد پردۂ غیب میں مستور ہو گیا اب پہلی مرتبہ میری کوششوں سے نمودار ہوا ہے۔

ھ: پرویز نے یہ جو لکھا ہے کہ دور نبوی میں (پرویزی ذہن کا) مبینہ نظام ربوبیت قائم ہو چکا تھا، لیکن اس کے ثبوت میں میں نے تاریخ و روایات سے شہادتیں پیش نہیں کیں، بل کہ صرف قرآنی آیات

© rasailojaraid.com

۲۶۱۔ مقدمہ قرآنی نظام ربوبیت ص ۲۴

© rasailojaraid.com

سے کام لیا ہے تو وجہ بالکل ظاہر وباہر ہے۔ قرآنی آیات میں شرم ناک معنوی تحریف میں انہیں مہارت تامہ حاصل ہے جس کے کچھ نمونے سابقہ مباحث میں پیش کئے جا چکے ہیں اور آئندہ بھی ان شاء اللہ العزیز ان کی نشان دہی حسب موقع وضرورت ہم کرتے رہیں گے۔ جہاں تک تاریخی روایات کا تعلق ہے تو وہ تو اس سلسلے میں وہ کثرت سے موجود ہیں۔ چناں چہ پرویز صاحب لکھتے ہیں: " خود ہماری تاریخ میں ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں لوگ زکوٰۃ کا روپیہ جھولیوں میں لیے پھرتے تھے اور کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ایسے معاشرے میں صدقہ وخیرات کے تمام احکام ساقط العمل ہو جائیں گے "۔[۲۶۲] اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت تک بھی ہرگز (پھر دہرایے) ہرگز پرویزی ذہن کا کوئی نظام ربوبیت اسلامی معاشرے میں قائم نہیں تھا۔ لوگ نجی املاک کے مالک تھے ورنہ زکوٰۃ ان پر فرض ہی کیوں ہوتی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی باطل نظام ہائے معیشت کی دو انتہاؤں کے درمیان اسلام کا عادلانہ نظامِ معیشت جو رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا تھا وہ اتنا بابرکت تھا کہ لوگ زکوٰۃ کے اموال لینے کے محتاج نہیں رہے تھے۔ لیکن زکوٰۃ کے مصارف میں صرف فقرا اور مساکین ہی شامل نہیں اس لیے زکوٰۃ کے احکام اسلامی معاشرے میں کبھی بھی ساقط العمل نہیں ہو سکتے۔ جہاں تک نفلی صدقات کا تعلق ہے تو وہ اغنیا کو بھی دیے جا سکتے ہیں۔

و: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: خیر الناس قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم[۲۶۳] "بہترین لوگوں کا زمانہ میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ بہترین ہیں جو (میرے زمانے کے) ان لوگوں سے قریب تر ہیں پھر وہ جو ان سے قریب تر ہیں"۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین کے ان زمانوں کو خیر القرون کہا جاتا ہے۔ ادھر جناب پرویز کی گستاخی اور جسارت کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے زمانے کے انسانی ذہن کو تو پختگی تک پہنچا ہوا خیال کرتے ہیں لیکن دور نبوی کے انسانی ذہن کو غیر پختہ اور خام قرار دیتے ہیں۔ ٹھہریئے یہ احادیث تو پرویز جیسے منکرین حدیث کے جھوٹے موقف کے لیے سم قاتل ہیں لہٰذا بہ قول پرویز یہ سب عجمی سازش کا نتیجہ ہیں۔ آیئے ہم جناب پرویز کو قرآن ہی سے جھوٹا کرتے ہیں۔ مثلاً سورۂ عنکبوت میں ہے: بَلْ ھُوَ اٰیٰتٌ ؑ بَیِّنٰتٌ " فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا

© rasailojaraid.com

۲۶۲۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۲۲۸

© rasailojaraid.com

الْعِلْمَ ط وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ[۲۶۴] "بل کہ یہ (قرآن) تو روشن آیتیں ہیں جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں اور ہماری آیتوں کا انکار صرف ظالم لوگ ہی کرتے ہیں"۔

اہل اسلام میں رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم کے اولین مخاطب صحابہ کرامؓ ہی تو ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے "اولوا العلم" (علم والے) قرار دیا ہے اور جن کے سینوں کو اسی کتاب کی آیات کا مخزن ٹھہرایا ہے۔ ادھر پرویز صاحب کا دعویٰ تو یہ ہے "حقیقت یہ ہے کہ ساری تعلیم کا منتہیٰ و مقصود قانون ربوبیت

کے مطابق معاشرہ کا قیام ہے۔ پورا قرآن ان تفاصیل سے بھرا پڑا ہے"۔[۲۶۵]

اور ساتھ ہی ان کا خیال یہ بھی ہے کہ دور نبوی کا انسانی ذہن اس قانون ربوبیت کو سمجھنے سے ہی قاصر تھا بعد میں بھی اگر کسی نے اسے سمجھا ہے تو یہ سعادت صرف جناب پرویز صاحب کو ہی حاصل ہوئی ہے۔ پرویز صاحب اہل حق علمائے ربانیین کو تو "جاہل ملا" کہنے کے عادی ہیں ہی، ان کا شوخ قلم صحابہ کرامؓ کی ناموس تک بھی جا پہنچا ہے کہ پرویز نے قرآن کو اور اس کے منتہا و مقصود کو تو سمجھ لیا لیکن صحابہ کرامؓ میں بہ قول ان کے اسے سمجھنے کی اہلیت نہیں تھی۔

ز: پرویز نے یہ جو لکھا ہے: "اگر مسلمان اسے (نظام ربوبیت کو) اسی "ایمان بالغیب" کے انداز سے جس سے یہ معاشرہ قائم ہوا تھا آگے چلاتے رہتے تو یہ آگے بڑھتا رہتا"[۲۶۶]

تو یہی پرویز صاحب ایمان بالغیب کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں "خدا کے نظام ربوبیت کے اَن دیکھے نتائج پر یقین رکھنا"۔[۲۶۷] اگر واقعی دور نبوی میں پرویزی سوچ کا کوئی نظام ربوبیت قائم ہوا تھا تو اس کے نتائج اَن دیکھے کیسے رہے؟ یہ تو سب کے سامنے ہونے کی وجہ سے محسوس و مشاہد ہو گئے، بہ الفاظ دیگر پردۂ غیب سے باہر نکل کر سب کے سامنے نمودار ہو گئے تو بتایئے پرویز صاحب کس ایمان بالغیب کو "آگے چلاتے رہنے" کی بات کر رہے ہیں اور پرویز صاحب کا یہ اعتراف بھی سامنے آچکا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں لوگ زکوٰۃ کے اموال جھولیوں میں لیے پھرتے تھے لیکن کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا، پس خود پرویز کے قلم سے بھی پرویز کا یہ دعویٰ قطعاً جھوٹا ثابت ہو رہا ہے کہ دور نبوی میں

۲۶۴۔ العنکبوت: ۴۹

۲۶۵۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۰۷

۲۶۶۔ ایضاً: ص ۸۸

۲۶۷۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۸۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(پرویزی فکر) کا نظام ربوبیت قائم ہوا تھا نیز ان کے بیانات میں دلچسپ اور ناقابل تطبیق تضادات بھی انہیں جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کافی، شافی اور وافی ہیں۔

ح: پرویز صاحب نے ایک مقام پر کیا ہی خوب لکھا ہے "اگر یہ (پرویزی تصورات) قرآن کی کسی حقیقت کی تائید کرتے ہیں تو ان سے قرآن فہمی میں مدد لیجیے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی چیز قرآن کے خلاف جاتی ہو تو بلا تامل اسے دیوار پر دے ماریے"۔[۲۶۸] بات اسلام کی پہلی بنیاد شہادتین (توحید الٰہی اور رسالتِ محمدی کی زبان سے گواہی) کی چل رہی تھی۔ بدقسمتی سے پرویز اور ان کے عقیدت مندوں نے عقائد اسلام اور ارکان اسلام کو نئے نئے عجیب و غریب معانی و مفاہیم اس لیے پہنائے کہ ان کے مجوزہ "نظام ربوبیت" کے لیے راہ ہموار ہو سکے لیکن ہم اس نظام ربوبیت کے سلسلے میں بھی جناب پرویز کے ذہنی انتشار، تضاد بیانی، جھوٹ اور فریب کو اوپر بڑی حد تک نمایاں کر چکے ہیں۔ کیا پرویزی منکرین حدیث خود پرویز صاحب کے مذکورہ بالا مشورے کی رو سے پرویز کی "نام نہاد قرآنی بصیرت اور فکر" کو بلا تامل دیوار پر دے مارنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟۔ اگر تیار ہیں تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ اگر نہیں تو اس کی معقول وضاحت مطلوب ہے۔

اقامتِ صلوٰۃ

اسلام کا دوسرا رکن نماز قائم کرنا ہے۔ اقامت صلوٰۃ کا ایک پرویزی مفہوم یہ ہے "قوانین خداوندی نے اس کا انتظام کر رکھا ہے کہ اس نظام (ربوبیت) کی بار بار یاد دہانی کرائی جائے تاکہ اس کے اصول و مبادی اجاگر ہونے چاہییں اور اس کی اہمیت نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اس یاد دہانی کا نام صلوٰۃ کا فریضہ موقت ہے یعنی خاص اوقات کا اجتماع"۔[۲۶۹] اقامتِ صلوٰۃ کا ایک اور پرویزی مفہوم یہ ہے "اس قانون ربوبیت کے پیچھے پیچھے تم بھی چلتے جاؤ۔ مصلّی اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو دوڑ میں پہلے نمبر پر آنے والے گھوڑے کے بالکل پیچھے پیچھے ہو جو ادھر ادھر کی راہوں پر نکل جائے وہ مصلّی نہیں"۔[۲۷۰] اقامتِ صلوٰۃ کا ایک اور پرویزی مفہوم یہ ہے "معاشرے کو ان بنیادوں پر قائم کرنا، جن پر ربوبیت نوع انسانی (رب العالمین) کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ قلب و نظر کا وہ انقلاب جو اس

۲۶۸۔ غلام احمد پرویز: معارف القرآن: ج ۲، ص ۲۹

۲۶۹۔ پرویز۔ قرآنی فیصلے: ص ۲۱

۲۷۰۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۶۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشرے کی روح ہے"۔[۲۷۱] اقامت صلوٰۃ کا ایک اور پرویزی مفہوم یوں ہے "نظام صلوٰۃ کیا ہے؟ اس کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا ہوں، لیکن قرآن کریم نے اس تمام تفصیل کو سمٹ سمٹا کر ایک فقرے میں رکھ دیا ہے یعنی وَلَم نَکُ نُطعِمُ المِسکِین[۲۷۲] "ہم مساکین کے رزق کا اہتمام نہیں کرتے تھے"۔[۲۷۳]

اقامتِ صلوٰۃ اور نماز پڑھنا پرویز کے نزدیک دو بالکل مختلف عمل ہیں۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں "صلوٰۃ یعنی نظام دین کی سمٹی ہوئی شکل جس سے مقصود اس نظام خداوندی کے خدوخال اور اغراض وغایات کو بار بار ذہن میں نمایاں اور دل میں منقوش کرنا تھا، اس کے برعکس نماز خدا کی پرستش کی رسم ہے جو ہر مذہب میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور پارسیوں کے ہاں اس کا نام تک بھی یہی ہے"۔[۲۷۴]

نماز کے آخری قعدہ میں تشہد کے بعد صلوٰۃ ابراہیمی (درود شریف) بھی شامل ہے جس میں محمد اور آل محمد پر درود بھیجا جاتا ہے۔ لیکن پرویز نے لکھا ہے کہ درود بھیجنا عجمی کارگہ فکر و سازش نے وضع کیا"۔[۲۷۵] اس کے ساتھ مزید یہ بھی لکھا ہے "آل محمد پر درود بھیجنا خالص نسل پرستی ہے"۔[۲۷۶] اب اگر بالفرض آپ کو پرویزی منکرین حدیث کہیں نماز پڑھتے نظر آجائیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی نمازیں تو مدینے کے منافقین بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔

زکوٰۃ

اسلامی ارکان میں زکوٰۃ کی ادائیگی نہایت اہم ہے۔ مسلمان اسے مالی عبادت قرار دیتے ہیں۔ زکوٰۃ کے مصارف میں سب سے پہلے فقراء اور مساکین آتے ہیں۔ زکوٰۃ اغنیا سے لی جاتی ہے اور اکثر و بیشتر صورتوں میں اس کے اولین مصرف فقرا اور مساکین پر لوٹائی جاتی ہے اس کے برعکس ٹیکس اگرچہ سرمایہ داروں اور تاجروں وغیرہ سے لیا جاتا ہے لیکن درحقیقت اس کا بوجھ عام لوگوں پر عموماً اور

۲۷۱۔ ایضاً: ص ۸۷
۲۷۲۔ المدثر: ۴۴
۲۷۳۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۶۲
۲۷۴۔ قرآنی فیصلے: ص ۳۷
۲۷۵۔ طلوع اسلام: نومبر ۱۹۵۱ء ص ۴۳
۲۷۶۔ طلوع اسلام: نومبر ۱۹۵۱ء ص ۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشرے کے مفلس و نادار طبقے پر خصوصاً پڑتا ہے۔ صنعت کار اور تاجر حضرات اپنی مصنوعات اور سامانِ تجارت کی قیمتوں میں مَن پسند اضافہ کر کے حکومت کو دیا گیا ٹیکس اپنے صارفین اور گاہکوں سے یعنی عوام الناس سے وصول کر لیتے ہیں۔

پس زکوٰۃ کو (معاذ اللہ) ٹیکس قرار دینا ظلم عظیم ہے۔ لیکن زکوٰۃ کے متعلق پرویزی سوچ یہی ہے۔ چناں چہ غلام احمد پرویز نے لکھا ہے: "اس لیے زکوٰۃ اس ٹیکس کے سوا اور کچھ نہیں جو اسلامی حکومت مسلمانوں پر عائد کرے۔ اس ٹیکس کی کوئی شرح متعیّن نہیں کی گئی، اس لیے کہ شرح زکوٰۃ کا انحصار ضروریات ملی پر ہے حتیٰ کہ ہنگامی صورتوں میں وہ سب کچھ وصول کر سکتی ہے جو کسی کی ضرورت سے زائد ہو (و یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو) لہٰذا جب کسی جگہ اسلامی حکومت نہ ہو تو زکوٰۃ بھی باقی نہیں رہتی"۔[۲۷۷] پرویزی فکر کے مطابق اسلامی حکومت تب قائم ہو سکتی ہے جب ان کے مفروضہ مرکز ملت کا ظہور و صدور ہو۔ ہم "مرکز ملت" کے مباحث میں ان مضامین میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ مرکز ملت کے صدور و ظہور کا پرویزی تصور ایسا ہے جس پر "نہ تو من تیل ہو گا اور نہ رادھا ناچے گی" کی ضرب المثل پوری طرح صادق آتی ہے۔[۲۷۸] منکرینِ حدیث کا یہ مفروضہ "مرکز ملت" جس طرح کا معاشی نظام قائم کرے گا اس میں کسی کی نجی ملکیت نہیں ہو گی اور تمام ذرائع پیداوار ریاست کی تحویل میں ہوں گے۔ اسی کو جناب پرویز صاحب "اسلامی حکومت" قرار دے رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ "جب کسی جگہ اسلامی حکومت نہ ہو تو زکوٰۃ بھی باقی نہیں رہتی"۔ چوں کہ دور حاضر میں پرویزی فکر کی کوئی "اسلامی حکومت" موجود ہی نہیں اس لیے پرویزی منکرین حدیث کے لیے زکوٰۃ کا حکم بھی باقی نہیں رہا۔ جب ان کا (مفروضہ) نظام ربوبیت نافذ ہو گا تو چوں کہ کسی فرد کی کوئی نجی اور انفرادی ملکیت ہی نہیں ہو گی اور ذرائع پیداوار سب کے سب ریاستی تحویل میں ہوں گے اس لیے زکوٰۃ کا قرآنی حکم پھر بھی ان منکرینِ حدیث کا منہ ہی دیکھتا رہ جائے گا۔ ان منکرینِ حدیث کے "اقامت صلوٰۃ" کی نوعیت تو پہلے مذکور ہو چکی ہے اب زکوٰۃ کے متعلق بھی معلوم ہوا کہ اس سے بھی انہیں آزادی حاصل ہے۔ جب ان کے خیال اور سوچ کی کوئی "اسلامی حکومت" ہی نہیں تو وہ زکوٰۃ کیوں دیں؟

روزہ

۲۷۷۔ قرآنی فیصلے: ص۳۵

© rasailojaraid.com

۲۷۸۔ شش ماہی مجلہ السیرۃ، عالمی شمارہ ۳۱ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ، جنوری ۲۰۱۴ء: ص ۳۱۲۔۳۲۲

© rasailojaraid.com

اس اہم اسلامی رکن سے بھی پرویز صاحب بے زار دکھائی دیتے ہیں جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کے کفارے کی تین صورتیں سورۂ مائدہ میں بیان فرمائی ہیں: فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ [۲۷۹] ''تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجے کا کھانا دینا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑا دینا ہے، یا ایک غلام یا لونڈی آزاد کرنا ہے اور جسے یہ میسر نہ ہو تو تین دنوں کے روزے رکھنا ہے''۔ لیکن پرویز صاحب روزوں سے ''چشم پوشی'' فرماتے ہوئے یوں لکھتے ہیں ''اگر غلامی ختم ہو جائے اور معاشرہ میں مسکینوں کا وجود بھی نہ رہے تو اس وقت اسلامی نظام فیصلہ کرے گا کہ اس (قسم) کے بدلے میں کفارہ کیا ادا کرنا چاہیے''۔ [۲۸۰] یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ قسم کے کفارے کی تیسری صورت بھی تین روزے رکھنے کی بھی تو آیت میں بیان کی گئی ہے جو قسم توڑنے والے کا انفرادی معاملہ ہے۔ اس سے پرویزی سوچ کے نام نہاد ''اسلامی نظام'' کا تعلق ہی کیا ہے؟ ان تین روزوں کے متعلق پرویز صاحب کی خاموشی خاصی معنیٰ خیز ہے۔

حج

پرویزی منکرین حدیث کے نزدیک حج کی حیثیت عبادت سے زیادہ محض ایک ملی تقریب اور اجتماع (کانفرنس) کی ہے اور ۱۰ ذی الحجہ کی قربانی صرف حجاج کے لیے ضروری ہے تاکہ مختلف ممالک سے آنے والے حجاج آپس میں قربانی کے ذریعے ایک دوسرے کی ضیافت کیا کریں۔ حال آں کہ اگر ایسا ہوتا تو حج کی قربانی کا حکم تو اہل مکہ اور حدودِ حرم کے اندر رہنے والے لوگوں کے لیے ہوتا، لیکن اس کے برعکس یہ حکم تو صرف ان حجاج کے لیے ہے جو ایام حج میں حج اور عمرے کو ملا کر تمتع یا قران کریں۔ حدودِ حرم کے اندر رہنے والوں کو تو تمتع اور قِران کی اجازت ہی نہیں وہ صرف حج افراد کرتے ہیں جس میں قربانی نہیں ہوا کرتی۔ نیز حجاج کا سب سے بڑا اجتماع تو ۹ ذی الحجہ کو میدان عرفات میں ہوتا ہے، لہٰذا اگر قربانی سے صرف حجاج کی ضیافت ہی مقصود ہوتی تو اس کا بہترین موقع عرفات کا میدان اور مناسب

۲۷۹۔ المائدہ:۸۹

۲۸۰۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۲۲۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاریخ ۹ ذی الحجہ تھی۔ ۱۰ ذی الحجہ کو کچھ لوگ رمی کر رہے ہوتے ہیں کچھ طواف زیارت کے لیے مکے پہنچ چکے ہوتے ہیں، کچھ طواف کے لیے جا رہے اور کچھ طواف کے بعد منیٰ واپس آ رہے ہوتے ہیں۔

حرم کعبہ کے متعلق پرویز نے یوں گل افشانی فرمائی ہے ''مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد حرم کی پاسبانی ہے، سیاسی معاہدات نہیں۔ واضح رہے کہ حرم کعبہ سے مراد سعودی عرب کا دارالسلطنت نہیں بل کہ دین کے نظام کا مرکز ہے جہاں سے قرآنی قوانین نافذ ہوں گے''۔[۲۸۱] لیجیے غلام احمد قادیانی نے قادیان کو مکے اور کعبے کا متبادل قرار دیا تھا اور اس کے ہم نام منکرین حدیث کے امام غلام احمد پرویز حرم کعبہ کا متبادل اس ''مرکز'' کو قرار دیتے ہیں جہاں سے ان کا مفروضہ ''مرکز ملت'' قرآنی قوانین کا نفاذ فرمایا کرے گا۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ مکہ مکرمہ موجودہ سعودی عرب کا کبھی بھی دارالسلطنت نہیں رہا اور نہ ہی دور نبوی اور دور خلفائے راشدینؓ میں دارالسلطنت رہا ہے۔ پرویز صاحب ''ملاؤں کی جہالت'' کا اپنی تحریروں میں بار بار رونا روتے ہیں لیکن یہ مقام عبرت ہے کہ اکثر و بیشتر وہ خود اپنی جہالت اور اپنی بے خبری سے بے خبر ہونے کی بنا پر جہل مرکب کے نمونے پیش فرماتے رہتے ہیں۔

چھٹا حصہ: قرآن کریم کو کھلونا بنانے کے پرویزی انداز

۱: جہل مرکب اور تکبر و عناد کا مظاہرہ

قرآن کریم میں معنوی تحریف کا ایک انداز یہ ہے کہ پرویز صاحب خصوصاً اور ان کے دیگر ہم نوا عموماً اہل حق کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے مقابلے میں اپنی طرف سے جو کچھ کہتے ہیں تو انکار حدیث اور تکبر و عناد کی نحوست سے ان کا ذہن ایسا ماؤف ہو جاتا ہے کہ انہیں اپنی مضحکہ خیز لغزشوں کا علم ہی نہیں ہو پاتا۔ اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

الف: قانون وراثت کے سلسلے میں فقہاء کرام کی (مفروضہ) غلطیوں کو شمار کرتے ہوئے غلام احمد پرویز لکھتے ہیں ''اور سب سے بڑی افسوس ناک صورت یہ کہ اس قانون کی رو سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ (معاذاللہ) خدا چوتھی جماعت کے بچوں جتنا حساب بھی نہیں جانتا۔ اس اصول کو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ جب کسی چیز کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے تو حاصل جمع ایک آنا چاہیے۔ اگر حاصل جمع ایک نہیں آتی تو ریاضی کے ابتدائی قاعدے کی رو سے یہ تقسیم غلط ہے۔ مثلاً (۱/۲ + ۱/۴ + ۱/۴ = ۱) یہ تقسیم

© rasailojaraid.com

۲۸۱۔ طلوع اسلام: دسمبر ۱۹۵۱ء

© rasailojaraid.com

درست ہے۔ لیکن (۳/۲=۱۲+۱۲+۲/۱) یہ تقسیم غلط ہے، کیوں کہ حصوں کا مجموعہ ایک نہیں بل کہ ۲/۱+۱ آتا ہے، یہ ہے۔ بہ ہر حال وہ قانونِ وراثت جسے ہم بڑے فخر سے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور انہیں سوچتے کہ اس سے ہم ایک طرف اللہ تعالیٰ کے متعلق کیا تصور پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف کس طرح عملی دنیا میں اپنے آپ کو اضحوکہ بناتے ہیں"۔ (۲۸۲)

عملی زندگی میں کیا ہونا چاہیے لیکن بعض اوقات حقیقتاً ہو کیا ہو جاتا ہے، اس میں یہاں جو لطیف فرق ہے، اسے سمجھنے سے پرویز صاحب قابلِ رحم حد تک بے بس نظر آتے ہیں اور اس امر کا عمدہ ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ انہیں اسلامی قانونِ وراثت کی ابجد کا بھی علم نہیں۔ اس کے باوجود وہ اہلِ علم فقہا کو اپنی بیمار ذہنیت کے تحت "بے وقوف" سمجھتے ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے مدینہ منورہ کے منافقین اپنے آپ کو عقل مند اور مسلمانوں کو بے وقوف کہتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الا اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ (۲۸۳) بے وقوف تو وہ خود ہی ہیں لیکن جانتے نہیں"۔ علم الفرائض (قانونِ وراثت) کے چند مسائل پر غور کیجیے:

۱۔ میت کے وارث بیوی، ماں باپ اور تین بیٹیاں ہیں۔ سورۂ نساء میں ورثا کے لیے بیان کردہ حصص کے مطابق بیوی کو میت کے ترکے کا آٹھواں حصہ، ماں اور باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ اور بیٹیوں کو دو تہائی ملے گا۔ یوں حصص کو جمع کرنے سے حاصل جمع (۸/۱+۶/۱+۶/۱+۳/۲=۲۴/۲۷=۱+۲۴/۳) یعنی ایک سے زائد ہوگا۔ دیکھیے یہ حصے فقہا نے اپنی طرف سے مقرر نہیں کیے بل کہ قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ اب یہاں فقہاء نہیں بل کہ پرویزی ذہن ہی یہ مضحکہ خیز نتیجہ برآمد کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حساب (معاذاللہ) چوتھی جماعت کے بچے سے بھیکم زور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فقہاء کو دین فہمی کی نعمت سے نوازا ہے وہ اس طرح کی صورتوں میں روایت و درایت دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے میت کے ترکہ کی تقسیم میں ورثاء کے حصص معلوم کرنے کے لیے اعداد ۳، ۶، ۸ کے ذواضعاف اقل ۲۴ کو ہی لیتے ہوئے ورثاء کے حصے بالترتیب ۳، ۴، ۴ اور ۱۶ برآمد کریں گے لیکن کل ترکے کو ۲۴ پر تقسیم کرنے کی بہ جائے برآمد شدہ حصص کے مجموعے (۱۶+۴+۴+۳)=۲۷ پر تقسیم کریں گے لہٰذا ورثاء میں حصص کی تقسیم سے

۲۸۲۔ پرویز۔ قرآنی فیصلے، ص ۱۱۵

۲۸۳۔ البقرہ: ۱۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میزان ۷/۲/۷/۲=۱ ہی رہے گی۔ اس عمل کو علم الفرائض (قانون وراثت) میں "عول" کہا جاتا ہے۔ بتایے حماقت و سفاہت فقہاء کے حصے میں آرہی ہے یا خود پرویز صاحب ہی ان اوصاف کے حامل ہیں؟

۲۔ مرنے والی خاتون کے وارث اس کا شوہر، ماں اور دو حقیقی بہنیں ہیں۔ شوہر کو نصف، ماں کو چھٹا حصہ اور بہنوں کو دو تہائی ملے گا لہٰذا ان کے حصص کا حاصل جمع ۲/۱+۶/۱+۳/۲=۶/۸=۳/۴=۳/۱+۱ ہوگا۔ یہاں بھی حصص کا مجموعہ ایک سے بڑھ گیا۔ حسب قواعد حصص معلوم کرنے کے لیے ۳،۶،۲ کا ذواضعاف اقل ۶ ہی لیا جائے گا اور اسی کے مطابق حصے متعین کیے جائیں گے، جو بالترتیب ۳،۱،۴ ہوں گے۔ تو میت کے ترکے کو ۶ کی بہ جائے حصص کی میزان (۳+۱+۴)=۸ پر تقسیم کیا جائے گا لہٰذا حصص کی تقسیم سے میزان ۸/۸=۱ ہی رہے گی۔

۳۔ مرنے والے شخص کے ورثا اس کی بیوی اور سات بیٹیاں ہیں۔ بیوی کو آٹھواں حصہ اور بیٹیوں کو دو تہائی ملے گا۔ پس حصص کا مجموعہ (۸/۱+۳/۲=۲۴/۱۹) ہوگا۔ دیکھیے یہاں بھی میزان=۱ نہیں بل کہ ایک سے کم ہے۔ یعنی میت کے ترکے کو ۲۴ پر تقسیم کرنے سے بیوی کو ۳ حصے اور بیٹیوں کو ۱۶ حصے ملیں گے لیکن (۲۴-۱۹)=۵ حصے پھر بھی باقی بچ جائیں گے۔ ایسی صورتوں میں علم الفرائض کے "اصولِ ردّ" کے تحت خاوند اور بیوی کے حصوں کو نہیں بڑھایا جاتا بل کہ باقی ماندہ ترکہ دیگر ورثا پر ان کے حصص کی نسبت سے لوٹایا جائے گا۔ چناں چہ یہاں باقی ماندہ پانچ حصے بیٹیوں کو ملیں گے۔ یوں بیوی اور بیٹیوں کے حصوں میں نسبت ۲۱:۳، بہ الفاظ دیگر ۷:۱ سے ہوگی۔ یعنی ترکہ آٹھ حصوں میں تقسیم ہوگا۔ ایک حصہ بیوی کو اور باقی ماندہ سات حصوں میں سے ہر بیٹی کو ایک ایک حصہ ملے گا لہٰذا حصص کی تقسیم سے میزان ۸/۸=۱ ہی رہے گی۔

ب: جن ورثاء کے حصے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعین فرما دیے ہیں انہیں علم الفرائض کی اصطلاح میں ذوی الفروض کہا جاتا ہے۔ ذوی الفروض میں ترکے کی تقسیم سے جو حصص باقی بچیں وہ جن ورثا میں تقسیم ہوتے ہیں۔ انہیں اصطلاح میں عصبات کہا جاتا ہے۔ عصبات میں الاقرب فالاقرب کا قرآنی اصول چلتا ہے کہ جو رشتہ دار میت سے قریب تر ہوگا وہ دور والے کو محروم کر دے گا۔ چناں چہ میت کے بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو حصہ نہیں ملے گا۔ اس کے برعکس غلام احمد پرویز نے لکھا ہے:

"وراثت کے قانون میں ایک چیز کو ہمیشہ مد نظر رکھنا چاہیے اور وہ ہے قائم مقامی، باپ کی وفات سے اس کا بیٹا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ وراثت کا سارا دارو مدار قائم مقامی پر ہے۔ درمیانی واسطہ اٹھ جانے سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعید کا رشتہ دار درمیانی واسط کا قائم مقام اور اس طرح میت سے اقرب ہو جاتا ہے۔ فقہا نے اقرب کا استعمال ورثا (زندہ رشتہ داروں) کے لیے کیا جس سے بہت سی غلطیوں میں پڑ گئے"[۲۸۴]

فقہا کی غلطیاں شمار کرتے ہوئے پرویز صاحب یتیم پوتے سے اپنے قارئین کے دلوں میں ہم دردی اور محبت کے جذبات ابھارنے کے لیے ایک مثال بھی پیش فرماتے ہیں کہ ایک شخص زید مر جاتا ہے اور اس کا ایک نابالغ بیٹا خالد ہے۔ ابھی وہ بالغ نہیں تھا کہ اس کا دادا زید فوت ہو جاتا ہے۔ ادھر اس کا بیٹا عمر زندہ ہے اور عمر کا ایک بیٹا حامد بھی زندہ ہے۔ یوں زید اپنے پیچھے اپنے ایک بیٹے عمر اور عمر کے بیٹے حامد کو دوسرے ایک یتیم پوتے خالد کو چھوڑ جاتا ہے۔ جس کی شکل یوں بنتی ہے:

زید (میت۔ دادا)

بکر (زید کے مرنے سے پہلے مر چکا ہے) عمر (زندہ ہے)

خالد (یتیم۔ زندہ ہے) حامد (زندہ ہے)

اس مثال کے بعد پرویز صاحب لکھتے ہیں "ہمارا فقہی قانون وراثت کہتا ہے کہ اس کی جائداد میں خالد (جو یتیم ہے) کچھ حصہ نہیں پائے گا۔ جائیداد عمر کو ملے گی (اور اس کی وساطت سے اس کے بیٹے حامد کو) اگر محض عقل عامہ کی رو سے بھی دیکھا جائے تو یہ فیصلہ سراسر ناانصافی پر مبنی دکھائی دے گا۔ خالد یتیم ہے اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں لیکن یہی اس کا جرم قرار دیا جاتا ہے"۔[۲۸۵]

ا۔ ہم پرویز صاحب کی مذکورہ مثال کو ہی لیتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ زید نے اپنے متوفی بیٹے بکر کو اعلیٰ تعلیم دلائی تھی جس کے بل بوتے پر وہ ایک اونچے سرکاری عہدے پر فائز ہو گیا لیکن وہ باپ کے حق میں گستاخ اور نافرمان ثابت ہوا۔ اس کا باپ زید بعد میں مالی مشکلات سے اس طرح دو چار ہوا کہ اپنے دوسرے بیٹے عمر کو تعلیم نہ دلا سکا، کیوں کہ متوفی بکر نے اپنی زندگی میں اپنے باپ کی کبھی کوئی مالی مدد نہیں کی تھی۔ بکر نے اپنی زندگی میں جائز و ناجائز ذرائع سے خاصی جائیداد بھی بنالی تھی۔ مثلاً اس نے دو مربع اراضی خرید لی اور مرتے وقت وہ غیر منقولہ جائداد مثلاً لاکھوں روپے بھی چھوڑ گیا تھا جس کا وارث اس کا واحد یتیم بیٹا خالد ہوا۔ ادھر زید کا دوسرا بیٹا عمر ساری عمر اپنے باپ زید کا فرمان بردار رہا۔ اس نے تھوڑا بہت جو کچھ کمایا زیادہ تر اپنے بوڑھے اور بیمار باپ کے علاج معالجے پر ہی خرچ کر ڈالا۔ اس لیے وہ اپنی

۲۸۴۔ قرآنی فیصلے ص ۱۲۱

۲۸۵۔ قرآنی فیصلے: ص ۱۱۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الگ جائداد نہ بنا سکا۔ جب زید فوت ہوا تو متوفی زید کی جائیداد کل چار ایکڑ زمین تھی۔ ادھر متوفی زید کا یتیم پوتا خالد اپنے متوفی باپ بکر کی دو مربع اراضی اور لاکھوں روپے کی رقم اپنے متوفی باپ بکر کے ترکے سے پہلے ہی لے چکا ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ خالد کی ماں (متوفی بکر کی بیوہ) بھی امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اس سے بھی خالد کو لاکھوں کی جائیدا ملنے کی توقع ہے۔ ان حالات میں "قائم مقامی کے پرویزی فارمولے" کے تحت پرویزی منکرینِ حدیث کا اصرار ہے کہ متوفی زید کی چار ایکٹر زرعی اراضی میں سے متوفی زید کے یتیم (مگر امیر و کبیر) پوتے خالد کو بھی دو ایکٹر ضرور بالضرور دیے جائیں جو پہلے ہی دو مربع اراضی اور لاکھوں روپے کا مالک ہے اور جس کے باپ بکر نے اپنے باپ زید کی کبھی خیریت تک بھی نہ پوچھی تھی۔ اب دیکھیے جس عقل پر فخر کرتے ہوئے اور اسلامی فقہی قانون کا مذاق اڑاتے ہوئے پرویز صاحب یتیم پوتے خالد کو اس کے چچا عمر کے ساتھ وارث بنانے کی سعی نامشکور میں لگے ہوئے ہیں تو کیا یہ عقل مدینہ منورہ کے ان منافقین کی عقل جیسی نہیں جو مسلمانوں کو بیوقوف کہا کرتے تھے؟ فرض کیجیے کہ کسی مرنے والے کے دو بیٹے وارث ہیں۔ ایک کروڑ پتی ہے اور دوسرا پائی پائی کا محتاج ہے تو کیا کروڑ پتی بیٹے کو حق وراثت سے اس بنا پر محروم کیا جا سکتا ہے کہ وہ پہلے ہی بہت مالدار ہے اور کیا مرنے والے کا سارا ترکہ اب بجائے صرف مفلس اور نادار بیٹے کو ہی ملے گا؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو معلوم ہوا کہ وراثت کا دار و مدار میت سے قرابت پر ہے۔ وارث کے مال دار یا فقیر و مفلس ہونے اسی طرح یتیم ہونے یا یتیم نہ ہونے جیسے حالات پر نہیں۔

۲۔ فرض کیجیے مذکورہ بالا مثال میں متوفی زید کے دونوں بیٹے بکر اور عمر پہلے ہی فوت ہو چکے ہیں۔ بکر کا یتیم بیٹا خالد زندہ ہے اور عمر کے چھ بیٹے اسلم، اکرم، اکبر، اصغر، افضل اور حامد بھی زندہ ہیں۔ اب ہم پرویز اور ان کے استاد حافظ محمد اسلم جیراج پوری کے خود ساختہ "قائم مقامی" کے فارمولے کے تحت متوفی زید کے پوتوں میں ترکہ تقسیم کریں گے تو خالد کو اپنے متوفی باپ بکر کا واحد "قائم مقام" ہونے کی وجہ سے کل ترکے کا نصف ملے گا۔ جب کہ عمر کے چھ یتیم بیٹے اپنے متوفی باپ کے قائم مقام ہونے کی بنا پر متوفی عمر کے دوسرے نصف حصے کے مالک ہوں گے یعنی ان چھ یتیم پوتوں کو فی کس (۲/۱ تقسیم ۶ = ۱/۲×۱/۶) = ۱:ج ۲، ص ا یعنی ہر کسی کو ترکے کا بارہواں حصہ ملے گا۔ یوں جائیداد ۱۲ حصوں میں تقسیم ہوگی جن میں سے چھ حصے تو یتیم پوتا خالد ہی لے اڑے گا اور باقی چھ یتیم پوتوں کو فی کس ایک ایک حصہ ملے گا، غور کیجیے یہاں [illegible] کا ایک فیصلہ [illegible] یہاں صحیح [illegible] قاعدے کے تحت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتوں یتیم پوتوں کا حصہ باہم مساوی ہوگا۔ ترکہ سات حصوں میں تقسیم ہوگا اور ہر یتیم پوتے کو ایک ایک حصہ ملے گا۔ لیکن "قائم مقامی" کے احمقانہ فارمولے کے تحت چھ یتیم پوتوں پر ناحق ظلم ہوگا۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ قائم مقامی کا یہ خود ساختہ فارمولا خاوند اور بیوی پر بھی لاگو ہونا چاہیے۔ آخر بیوی اپنے متوفی خاوند کی اور خاوند اپنی متوفی بیوی کا قائم مقام کیوں نہیں ہوسکتا؟ فرض کیجیے پرویز صاحب کی پیش کردہ مذکورہ مثال میں متوفی زید کے متوفی بیٹے بکر کا کوئی بیٹا نہیں تھا، بل کہ وہ مثلاً حلیمہ نام کی ایک بیوہ چھوڑ گیا تھا جو بوڑھی بیمار اور لاچار اور مفلس و نادار بھی ہے یوں متوفی زید کے ورثا میں اس کی ایک بہو (جس کا خاوند بکر فوت ہوچکا ہے) اور ایک زندہ بیٹا عمر ہے۔ کیا منکرینِ حدیث متوفی بکر کی بیوہ حلیمہ کو بھی اپنے متوفی خاوند کا قائم مقام ٹھہرا کر اسے متوفی زید کے ترکے سے حصہ دلائیں گے یا نہیں جب کہ وہ بوڑھی بھی ہے بیمار و لاچار اور مفلس و نادار بھی ہے۔ دوسری طرف متوفی زید کا زندہ بیٹا عمر تنومند اور مال دار بھی ہے۔ اگر نہیں تو منکرینِ حدیث کی ساری ہم دردیاں یتیم پوتے سے کیوں ہیں؟ یہ بیوہ ان کی ہم دردی سے کیوں محروم ہے؟۔ منکرینِ حدیث اس سے بھی بے خبر نہیں ہوسکتے کہ باپ کے فوت ہونے کے بعد بیٹوں کی بھاگ دوڑ عموماً یہی ہوتی ہے کہ بہنیں (میت کی بیٹیاں) اور ماں (میت کی بیوی) جائداد سے حصہ نہ لینے پائیں، وہ انہیں عدالتوں میں گھسیٹے پھرتے ہیں اور ان سے اپنے حق میں دست برداری کا بیان دلاتے ہیں۔ منکرینِ حدیث کو ان خواتین سے کیوں ہم دردی نہیں؟

۴۔ یہاں دل چسپ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ مثال میں خالد نام کا پوتا اگر اپنے دادا زید کی موت کے وقت بالغ ہو اور بالغ ہونے کی وجہ سے یتیم نہ رہے تو کیا اسے زید کے ترکے میں سے کچھ ملے گا یا نہیں؟ اگر نہیں تو وہ اپنے متوفی باپ بکر کا قائم مقام کیوں نہ رہا؟ اگر ملے گا تو بتایے کہ پوتے کے ساتھ "یتیم" کی قید لگانے کا آخر مقصد کیا ہے؟ منکرین حدیث کی طرف سے سیدھا یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ متوفی زید کا پوتا خالد بھی اپنے دادا کا وارث ہوگا۔ یہاں "یتیم" کی قید لگانے اور اس کے ساتھ ہم دردی کے جذبات ابھارنے کا کیا مقصد ہے؟

۵۔ منکرینِ حدیث کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر دادا باپ کی وفات کی وجہ سے پوتے سے حصہ پاسکتا ہے تو پوتا باپ کی وفات کی وجہ سے دادا کا حصہ کیوں نہیں پاسکتا؟ سخت حیرت ہے کہ یہ لوگ اتنی موٹی سی بات سمجھنے سے بھی قاصر کیوں ہیں کہ کسی کا ایک سے زیادہ باپ، دادا یا پڑدادا نہیں ہوسکتا لیکن بیٹے پوتے پڑپوتے تو بہت سے ہوسکتے ہیں۔ اگر کسی میت کا باپ پہلے ہی فوت ہوچکا ہو اور اس کا دادا اور چچا زندہ ہوں تو باپ کے فوت ہونے کی وجہ سے دادا ہی میت کا اقرب ہوگا۔ چچا باپ نہیں بل کہ باپ کا بھائی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۶۔ پوتا ہو یا مرنے والے کا کوئی بھی ایسا رشتہ دار ہو جو شرعاً اس کے ترکہ کا وارث نہیں ہو سکتا خواہ ایسا وارث یتیم ہو یا نہ ہو تو اس کی معاشی مشکلات کا حل یہ نہیں کہ احکام وراثت میں ناحق تغیر و تبدل کیا جائے۔ اس کا حل یہ ہے کہ مرنے والا اپنی زندگی میں ایسے کسی رشتہ دار کے لیے (زیادہ سے زیادہ) اپنے تہائی مال تک کی اس کے لیے وصیت کر سکتا ہے۔ خود ورثا کا بھی اخلاقی اور بعض صورتوں میں قانونی فرض ہے کہ وہ اس کی مدد کریں۔ چناں چہ سورۂ نساء میں ہے کہ اگر میت کے ترکہ کی تقسیم کے وقت قرابت دار اور مسکین اور یتیم حاضر یعنی موجود ہوں تو تم اس میں سے کچھ ان کو بھی دے دو اور ان سے نرمی سے بولو۔[۲۸۶]

ج: ناسخ و منسوخ آیات کے ضمن میں مسٹر غلام احمد پرویز علمائے کرام کو یوں آڑے ہاتھوں لیتے ہیں " پھر یہ بھی سوچیے کہ قرآن کی بعض آیتیں دوسری آیت سے منسوخ ہو چکی ہیں تو اس سے قرآن بھیجنے والے خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق کیا خیال قائم ہوتا ہے۔ اسے (یعنی ملا کو) صرف اس سے غرض ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اس میں کہیں فرق نہ آجائے خواہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہودی مکذوبات ہوں۔ مجوس کی مخترعات ہوں یا ضادید عجم کی خرافات۔ ملا کے نزدیک جو کچھ کتاب میں چھپا ہوا ہے سند ہے"۔[۲۸۷]

ہم یہاں ماڈرن مُلا غلام احمد پرویز کو خود ان کی تحریروں سے ثابت کر دکھاتے ہیں کہ وہ خود ہی اپنی تحریروں سے جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ صرف جھوٹے ہی نہیں بل کہ آخر میں ہم یہ بھی ثابت کر دکھائیں گے کہ وہ خود اپنی ہی تحریروں اور مضامین کی رو سے مشرک بھی ہیں۔ سورۂ محمد میں جنگی قیدیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً[۲۸۸] ماڈرن ملا پرویز صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے: "انہیں یا تو بہ طور احسان چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو"۔[۲۸۹]

اس سے پرویز صاحب نے استدلال کیا ہے کہ جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈی نہیں بنایا جا سکتا۔ ادھر قرآن کریم میں لونڈیوں سے تمتع کے جواز کا ذکر متعدّد مقامات پر ہے۔ مثلاً سورۂ نسا میں ہے کہ اگر تمہیں ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنے میں ان کے درمیان ناانصافی کا اندیشہ ہو تو ایک ہی خاتون

۲۸۶۔ النساء:۹

۲۸۷۔ قرآنی فیصلے: ص ۳۴۰

© rasailojaraid.com

۲۸۸۔ محمد:۴

۲۸۹۔ قرآنی فیصلے: ص ۸۴

© rasailojaraid.com

سے نکاح کرو یا لونڈی پر گزارہ کرو"۔[۲۹۰] اس طرح کی آیات کے متعلق پرویز کا جواب یہ ہے کہ ان غلاموں اور لونڈیوں کا تعلق جنگی قیدیوں سے نہیں بل کہ یہ وہ غلام اور لونڈیاں ہیں جو پہلے ہی سے چلے آرہے تھے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سورہ محمد کی مذکورہ آیت کی رو سے جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈیوں بنانے کی واقعی ممانعت ثابت ہوتی ہے تو اس سورت کے نزول کے بعد سابقہ غلاموں اور لونڈیوں کو فوراً آزاد کر دینے میں کونسا امر مانع تھا؟۔ نیز سورۂ احزاب میں ہے: یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ الّٰتِیْٓ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْکَ[۲۹۱] "اے نبی! ہم نے تیرے لیے تیری وہ بیویاں حلال کر دی ہیں جنہیں تو ان کے مہر دے چکا ہے۔ اور وہ لونڈیاں بھی جو اللہ نے تجھے غنیمت میں دی ہیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں وہ لونڈیاں مراد ہیں جو جنگی قیدیوں کے طور پر رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہوئی تھیں۔ ان سے تمتع کی اجازت اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو عطا فرمائی۔ چناں چہ حضرت جویریہؓ اور حضرت صفیہؓ غزوۂ بنی مصطلق اور غزوۂ خیبر میں جنگی قیدی ہونے کی بناء پر آپ کی ملکیت میں آئیں تو آپ نے انہیں آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا جب کہ ریحانہ قرظیہؓ او رماریہ قبطیہؓ بہ طور لونڈی آپ کے پاس رہیں۔ اب اگر سورہ محمد کی مذکورہ آیت کا یہ مطلب لیا جائے (جیسا کہ پرویز صاحب کا اصرار ہے) کہ اس آیت سے جنگی قیدیوں اور لونڈیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانا ممنوع ہو گیا تھا تو اس کا صاف مطلب یہی تو ہوا کہ اس سے پہلے دور نبوی میں جنگی قیدیوں کو غلام او رلونڈیاں بنایا جاتا تھا اور نہ اموال غنیمت سے حاصل ہونے والی لونڈیوں سے رسول اللہ ﷺ کو تمتع کی اجازت دینے کا کوئی موقع ہی نہ ہوتا اور سورۂ احزاب کی متعلقہ آیت کا نزول ہی (معاذ اللہ) لایعنی اور عبث ہوتا۔ پس پرویز صاحب نے سورہ محمد کی متعلقہ آیت کا جو مطلب لیا ہے اس کے مطابق سورہ محمد کی آیت کے متعلقہ حصے کو ناسخ اور سورہ احزاب کی آیت کے متعلقہ حصے کو منسوخ ماننے بغیر چارہ ہی نہیں ہوگا۔ اب غور کیجیے مُلا پر جو اعتراض پرویز نے کیا تھا کیا وہ خود انہیں پر نہیں پلٹ آیا؟ ہم نے یہ الزاماً لکھا ہے اگر سورہ محمد کی آیت کا ترجمہ صرف "احسان کرنے" کی بہ جائے "احسان کرتے ہوئے چھوڑ دینے" کا ہی کیا جائے تو یہ حکم امر اباحت ہے کہ حاکم مجاز کے لیے جنگی قیدیوں کو احسان رکھتے ہوئے بغیر فدیہ لیے چھوڑ دینے کی اجازت ہے اور اگر فدیہ لے کر چھوڑنا چاہے تو اس کی بھی اجازت ہے لیکن ایسا کرنا

© rasailojaraid.com

۲۹۰۔ النساء: ۳

۲۹۱۔ الاحزاب: ۵۰

© rasailojaraid.com

اس پر فرض اور واجب نہیں ہے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ کو سورہ احزاب کی مذکورہ آیت کی رو سے بھرپور اجازت تھی کہ آپ حضرت جویریہؓ اور حضرت صفیہؓ کو بہ طور لونڈی اپنے پاس رکھتے لیکن آپ نے ان پر احسان فرماتے ہوئے انہیں آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔

سورۂ بقرہ میں ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا صلے ج الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ج [۲۹۲] "تم پر یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑ جاتا ہو تو وہ اپنے ماں باپ اور قرابت داروں کے لیے اچھائی کے ساتھ وصیت کر جائے"۔ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے والدین کا حصہ تو خود ہی مقرر فرمایا [۲۹۳] جب کہ میت کے قریب ترین رشتہ داروں یعنی اولاد کے لیے تاکیدی حکم یوں صادر فرمایا: يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ق لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ۔ [۲۹۴] "اللہ تمھاری اولاد کے متعلق تمہیں وصیت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہوگا"۔ اب دیکھیے اگر مرنے والا مثلاً بیٹے کا حصہ بہ ذریعہ وصیت بڑھا دے تو بیٹی پر ظلم ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے مذکورہ تاکیدی حکم کی کھلی خلاف ورزی ہوگی۔ اسی طرح اگر وہ بیٹی کا حصہ بڑھا دے تو بیٹے پر ظلم ہوگا لہٰذا یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ سورۂ نساء میں وارثوں کے جو حصے متعین کر دیے گئے ہیں ان میں کوئی بھی شخص بہ ذریعہ وصیت کمی بیشی کا مجاز نہیں رہا۔ اب وصیت صرف ان رشتہ داروں کے لیے ہی ممکن ہے جو شرعاً وارث نہ بنتے ہوں۔ سورۂ انفال میں ہے: إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ج وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا۔ [۲۹۵] "اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں گے تو وہ ایک ہزار کافروں پر غالب رہیں گے"۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ط فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ج وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ط وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ [۲۹۶]

۲۹۲۔ البقرہ:۱۸۰

۲۹۳۔ النساء:۱۱

۲۹۴۔ ایضاً

۲۹۵۔ الانفال:۶۵

۲۹۶۔ الانفال:۶۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"اچھا اب اللہ نے تمھارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ تم میں ناتوانی ہے پس اگر تم میں ایک سو صبر کرنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں گے تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔ ان آیات سے صاف واضح ہے کہ مسلمانوں کو پہلے اپنے سے دس گنا دشمن کے خلاف لڑنے کا حکم دیا گیا پھر تخفیف فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے سے دو گنا دشمن کے خلاف لڑنے کا حکم دیا۔ یعنی دوسرا حکم ناسخ اور پہلا حکم منسوخ ہے۔

اگر حاکم اپنے حکم کو اس لیے کالعدم قرار دے یا پہلے حکم کی بہ جائے نیا حکم اس لیے لائے کہ اس کا حکم نامناسب، بے محل، ناقص اور غلط تھا۔ یا وہ اپنا حکم اس لیے منسوخ یا تبدیل کرے کہ حکم تو بالکل درست تھا لیکن لوگوں نے اسے قبول نہ کیا ہو اور حاکم پر دباؤ ڈال کر اسے منسوخ یا تبدیل کرایا ہو تو اللہ تعالیٰ کے احکام میں ایسے نسخ کا قائل ہونا تو بلا شبہ کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے نیز وہ غالب و برتر ہے کسی سے مغلوب نہیں ہوتا۔ اگر حاکم پہلا حکم کالعدم کر دے کہ عین حکمت و مصلحت پر مبنی اس حکم پر عمل کرانے کا مقصد اور وقت پورا ہو گیا یا وہ اپنے پہلے حکم کو بدل کر نیا کا حکم لائے کہ پہلا حکم ایک خاص وقت اور مقصد کے تحت تھا وہ وقت گزر گیا اور مقصد حاصل ہو گیا لہٰذا نئے وقت اور نئے تقاضوں کے تحت نیا حکم جاری کر دیا، یا پہلا حکم سخت تھا اس میں تخفیف اس لیے کر دی کہ لوگ خوش ہو جائیں او ر حاکم کے شکر گزار ہوں تو اس طرح کے نسخ پر کسی عقل مند کو ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ بل کہ اس طرح کے نسخ سے تو حاکم کی قدرت و حاکمیت اور اس کے علم و حکمت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ چناں چہ سورۂ بقرہ میں ہے "مَا نَنسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ"[297] "جس آیت کو ہم منسوخ کریں یا (لوگوں کے ذہنوں سے) اسے فراموش کر دیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور لے آتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے؟ کیا تو نہیں جانتا کہ زمین و آسمان کی حکومت اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ کے سوا تمھارا کوئی ولی اور مددگار نہیں"۔

پس یہ سمجھ لینا کہ صرف شرائع سابقہ کے احکام ہی منسوخ ہو سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ پر نزول کے ۲۳ سالہ دور میں کوئی حکم کبھی منسوخ ہوا ہی نہیں، پرلے درجے کی حماقت و سفاہت اور بے خبری و جہالت ہے۔

© rasailojaraid.com

۲۹۷۔ البقرہ: ۱۰۶۔۱۰۷

© rasailojaraid.com

نسخ احکام پر مسٹر پرویز کے اعتراضات بعینہ یہود و نصاریٰ کے اعتراضات کی طرح ہیں، کیوں کہ مسٹر پرویز یہود و نصاریٰ اور دیگر غیر مسلموں کے افکار و نظریات سے بری طرح متاثر ہیں۔ ایک مقام پر تو وہ یہ لکھتے ہیں: ''یہ بھی یاد رہے کہ میرے نزدیک یہ شرک ہے کہ انسان اپنے ذہن میں پہلے سے کوئی خیال لے کر قرآن کی طرف آئے اور پھر قرآن سے اس کی تائید کرنا شروع کر دے۔ قرآن سے صحیح رہ نمائی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خالی الذہن ہو کر اس کی طرف آئے اور اس کے ہاں سے جو کچھ ملے اسے من و عن قبول کرے خواہ یہ اس کے ذاتی خیالات، رجحانات، معتقدات اور معمولات کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو''۔[۲۹۸] مندرجہ بالا اقتباس پڑھ کر بے اختیار منہ سے نکلتا ہے ''تیرے منہ میں مٹھائی، ماشاء اللہ! سبحان اللہ!''۔ اب کوئی اور نہیں بل کہ یہی پرویز صاحب ''خالی الذہن'' ہو کر قرآن کا جس طرح مطالعہ فرمایا کرتے تھے اس کا حال وہ خود اپنے قلم سے یوں بیان کرتے ہیں ''میں نے انسانی زندگی کے اہم مسائل میں سے ایک ایک مسئلہ کو لیا اور یونان کے فلاسفروں سے لے کر اس وقت تک ان کے متعلق مختلف ائمہ فکر نے جو کچھ کہا ہے، اس کا بہ غور مطالعہ کیا۔ اس طرح ایک ایک مسئلہ کے متعلق انسانی فکر کے اہم گوشے میرے سامنے آگئے۔ اس کے بعد میں نے انسانی فکر کی اس اڑھائی ہزار سالہ کدو کاوش کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں کیا۔ قرآن کا اس طرح مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا ایک ایک دعویٰ زندہ حقیقت بن کر سامنے آگیا۔ اس کے بعد میرے لیے زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق قرآن کی رہ نمائی کا تعین کرنا مشکل نہ رہا۔ مجھے قرآن کی صداقتوں کا جو یقین اس طرح حاصل ہوا وہ نہ زبان سے بیان ہو سکتا ہے نہ قلم سے ادا''۔[۲۹۹]

پرویز صاحب کے اس اقتباس کا ان کے پہلے اقتباس سے تقابل کیجیے تو یہ معلوم کرنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی کہ پرویز نے قرآن کا مطالعہ ہرگز ہرگز خالی الذہن ہو کر نہیں فرمایا تھا بل کہ اس مطالعے سے قبل ان کا ذہن اڑھائی ہزار سالہ دور کے عجمی فلسفیوں کے افکار سے لدا ہوا تھا۔

قصہ آدم و ابلیس جو قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مذکور ہے اسے ایک فرضی اور تمثیلی داستان قرار دے ڈالا۔ ان کے نزدیک آدم کسی فرد واحد کا نام نہیں ہے اور یوں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے پہلے نبی

۲۹۸۔ پرویز۔ مفہوم القرآن، مقدمہ، ص [illegible]

۲۹۹۔ پرویز۔ انسان نے کیا سوچا: پیش لفظ، ص ۵۔۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کا ہی انکار کر دیا۔ ان کی تصنیف ''ابلیس و آدم'' اسی کو ظاہر کرتی ہے اور مثلاً ہیگل اور کارل مارکس جیسے عجمی یہودی مفکرین کے افکار سے وہ اس قدر مرعوب و مغلوب اور مخمور و مسحور ہوئے کہ اشتراکیت جیسے ملحدانہ نظامِ معیشت و سیاست کو ''قرآنی نظامِ ربوبیت'' کے نام سے قرآن کا وہ اولین مقصد قرار دے بیٹھے جسے پوری امتِ مسلمہ میں ان کے سوا کوئی اور آج تک ٹھیک سمجھ ہی نہ سکا۔ چناں چہ آپ ارشاد فرماتے ہیں: ''قرآن نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ الدین سے مفہوم نظامِ ربوبیت کا قیام ہے''[۳۰۰] لیکن بہ قول پرویز قرآن کے ان ''واضح الفاظ'' کا مطلب صرف انہیں کی سمجھ میں آیا دوسروں کو یہ سعادت حاصل نہیں ہو سکی۔ چناں چہ وہ مزید ارشاد فرماتے ہیں ''جہاں تک میرا مطالعہ رہ نمائی کرتا ہے قرنِ اول کے بعد (کہ جس میں یہ نظام اس زمانے کے حالات کے مطابق اپنی عملی شکل میں قائم ہوا تھا) اسلام کی تاریخ میں میری یہ پہلی کوشش ہے جس میں اس نظام کو سامنے لایا گیا ہے''۔[۳۰۱]

جب بہ قول پرویز یہ نظام اپنی عملی شکل میں قرنِ اول میں قائم ہوا تھا تو صحابہ کرامؓ تو ضرور اس کو پوری طرح سمجھ گئے ہوں گے، لیکن پرویز صاحب اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لیکن اس کے بعد یہ بھی حقیقت ہے کہ جس زمانے (چھٹی صدی عیسوی) میں قرآن نازل ہوا ہے ذہن انسانی اپنی پختگی تک نہیں پہنچ چکا تھا۔ اس نے محض اپنے عہدِ طفولیت کو چھوڑا تھا اب اسے رفتہ رفتہ پختگی تک پہنچنا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فقید المثال تعلیم اور سیرت سے قرآنی اصولوں کو معاشرے میں نافذ العمل کر کے دکھا دیا تھا کہ معلوم ہو جائے کہ یہ اصول ناممکن نہیں۔ لیکن اس زمانے کی دنیا ہنوز ذہنی طور پر اس سطح پر نہیں آچکی تھی کہ وہ ان اصولوں کو یا ان کی بنیادوں پر قائم کردہ معاشرے کو شعوری طور پر اپنا سکے۔ یہ چیزیں ابھی ان کے شعور میں سما ہی نہیں سکتی تھیں... ''[۳۰۲] جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس عجیب و غریب انکشاف کے ساتھ ساتھ پرویز کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ قرآن کا نزول صرف اور صرف نظام ربوبیت کے قیام کے لیے تھا اور قرآن نے اس مقصد کو مبہم اور گول مول یا پیچیدہ الفاظ میں نہیں بل کہ بہ قول پرویز ''واضح الفاظ'' میں بتایا ہے لیکن اس دور کے لوگوں کا بہ الفاظ دیگر صحابہ کرامؓ کا ذہن اتنا ناپختہ، خام اور نابالغ تھا کہ وہ اسے کماحقہ سمجھ ہی نہیں سکا یا کم از کم یہ تو ضرور ہوا کہ اسے سنبھال ہی نہیں سکا ان

۳۰۰۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۶۴

۳۰۱۔ ایضاً۔ مقدمہ ص ۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حالات میں پرویز صاحب رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کو معلوم نہیں "فقید المثال" کس معنی میں قرار دیتے ہیں، کیوں کہ ساتھ ہی بین السطور وہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے قرآن اتارا تھا اور جس مقصد کی خاطر اللہ کے رسول نے اسے صحابہ کرامؓ تک پہنچایا تھا تو اس میں اللہ اور رسول دونوں کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) سخت ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ پرویزی افکارِ باطلہ کے لازمی نتائج کے مطابق اگر اللہ اس پر قادر نہیں تھا کہ اس دور کے لوگوں (قرآن کے اولین مخاطب صحابہ کرامؓ) کے ذہن کو پختگی تک پہنچا دیتا تو اسے مناسب وقت تک انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اس نے (معاذ اللہ) خواہ مخواہ اپنے رسول کو سیکڑوں برس پہلے بھیج دیا۔ نیز رسول اللہ ﷺ تو ان ناپاک پرویزی تصورات کے تحت قرآن کے حقیقی پیغام (نظام ربوبیت کے قیام) کو صحابہ کرامؓ کے نابالغ اور ناپختہ ذہن میں نہ اتار سکے البتہ چودہویں صدی ہجری میں امت میں سے واحد شخص غلام احمد پرویز نے اڑھائی ہزار سالہ عجمی افکار (مشرک یونانی فلسفیوں، دہریوں، یہودیوں، عیسائی اور مجوسی مفکرین وغیرہ کے افکار) کی "برکت" سے اسے اپنے پختہ اور بالغ ذہن میں بہ خوبی اتار لیا اور اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسے لوگوں کے سامنے رکھ دیا۔ غور کیجیے کہ پرویز صاحب کا بین السطور یہ دعویٰ کہ قرآن کے "واضح الفاظ" میں مذکور پیغام اور مقصود و منتہیٰ کو نہ تو صحابہ کرامؓ کا ناپختہ اور نابالغ ذہن سمجھ پایا تھا نہ ہی بعد میں سوائے مسٹر پرویز کے بالغ ذہن کے کسی اور کو اس کی ہوا تک لگی تو یہ ہرزہ سرائی مسٹر پرویز کو کذاب و مفتری یا مجنون اور از خود رفتہ قرار دینے کے لیے کافی نہیں؟ پرویز صاحب نے یہ بھی تو ارشاد فرمایا تھا کہ جو شخص قرآن کا مطالعہ خالی الذہن ہو کر نہ کرے وہ مشرک ہے اور پھر خود ہی یہ انکشاف بھی فرمایا تھا کہ انہوں نے اپنے ذہن کو اڑھائی ہزار سالہ عجمی افکار سے آلودہ کر کے قرآن کا مطالعہ فرمایا ہے تو کیا وہ اپنے ہی قلم سے اپنے مشرک ہونے پر مہر تصدیق ثبت نہیں کر رہے؟ مثل مشہور ہے چور مچائے شور، عجمی افکار کا دلدادہ اور ان سے مسحور و مخمور ہو کر نہایت بے باکی اور ڈھٹائی سے قرآن کریم میں معنوی تحریف کرنے والا، اللہ، رسول اور صحابہ کرامؓ کی بین السطور توہین کرنے والا، صحابہ کرامؓ کے ذہن کو نابالغ و ناپختہ اور اپنے ذہن کو بالغ و پختہ سمجھنے والا تو خود مسٹر غلام احمد پرویز ہے جو مفکر قرآن ہونے کا یوں مدعی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اقوال، افعال اور تقریرات سے یعنی اپنی سنت مبارکہ اور اپنے اسوۂ حسنہ سے جو بیانِ قرآن امت کو عطا فرمایا ہے وہ تو ان کے نزدیک ... قابل قبول ہے وہ تو اس کے نزدیک حجت (واجب التسلیم) ہی نہیں لیکن یونانی مشرکین، یہود و نصاریٰ، دہریہ، فلاسفہ و مفکرین (خواہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے افکار اڑھائی ہزار سالہ پرانے ہی کیوں نہ ہوں) اس کے نزدیک قرآن فہمی کے لیے نہایت قیمتی اثاثہ ہیں اُلٹا وہ اپنے ناپاک منہ اور غلیظ قلم سے "ملا" پر یہودی ملذوبات، مجوسی اختراعات اور ضادید عجم کی خرافات قبول کرنے کا جھوٹا الزام عائد کر رہا ہے۔ فیاللعجب!!!

۲: قرآن پر عجمی افکار کو مسلط کرنے کی ناپاک مساعی

قرآن کریم کا مطالعہ پرویز صاحب نے اپنے کھلے اقرارات کے مطابق اڑھائی ہزار سالہ عجمی افکار سے اپنے ذہن کو خوب آلودہ کرنے کے بعد کیا ہے اس لیے قرآن کریم میں معنوی تحریف کا ایک مکروہ پرویزی انداز یہ ہے کہ عجمی افکار پر مبنی اپنے خود ساختہ مضامین کو اپنی تیار کردہ عجمی سازش کے تحت قرآن پر وہ یوں مسلط کرتے ہیں کہ شروع میں "قرآن کہتا ہے" جیسے کلمات کا اضافہ فرما دیتے ہیں۔ اس کے بعد چل سو چل، جو چاہا نہایت بے باکی سے قرآن کے ذمہ لگا دیا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ پرویز صاحب انہیں قرآن پڑھا رہے ہیں۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

الف: "قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ جو لوگ نظام ربوبیت کو اپنا نصب العین بنائیں اور اس کے بعد ایسا پروگرام مرتب کریں جو انسانوں میں ہمواریاں پیدا کرنے کا موجب ہو اور ان کے برعکس جو لوگ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کریں ان دونوں کی زندگی کبھی یکساں نہیں ہو سکتی"۔(۳۰۳)

ب: "قرآن نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ الدین سے مفہوم نظام ربوبیت کا قیام ہے"۔(۳۰۴)

ج: "قرآن نے کہا ہے کہ سرمایہ داری باطل نظام ہے اس لیے باقی نہیں رہ سکتا۔ باقی وہی نظام رہے گا جو نوعِ انسانی کی ربوبیت اور منفعت کا ضامن ہوگا"۔ (۳۰۵)

د: "قرآن کہتا ہے کہ اگر (نظام ربوبیت کی حامل پارٹی) نے استقامت برتی تو وہ وقت آجائے گا جب مشیت کے اٹل قانون کے مطابق ان کا تعمیری پروگرام مخالفین کے تخریبی پروگرام پر غالب آجائے گا۔ اسی کا نام انقلاب ہے"۔ (۳۰۶)

۳۰۳۔ قرآنی نظام ربوبیت: ص ۱۱۹

۳۰۴۔ ایضاً: ص ۱۶۴

۳۰۵۔ ایضاً: ص ۲۰۵

۳۰۶۔ ایضاً: ص [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غور کیجیے پرویز کے خیال کے مطابق قرآن "نظام ربوبیت" کے چکر سے باہر نکلتا ہی نہیں اور ساتھ ہی پرویز کے اس انکشاف کا بھی لطف اٹھایے کہ اس "نظام ربوبیت" کو صحابہ کرامؓ کا نابالغ اور ناپختہ ذہن سمجھ نہیں سکا تھا۔ بعد میں بھی جب پرویز کے زمانے میں انسانی ذہن پختگی کو پہنچا ہوا تھا تو بھی اسے پرویز نے ہی سمجھا کیوں کہ وہ فرماتے ہیں "... اسلام کی تاریخ میں یہ میری پہلی کوشش ہے جس میں اس نظام کو سامنے لایا گیا ہے"۔ (۳۰۷)

© rasailojaraid.com